ابتدا تیرے نام سے

محترم قارئین! لُو میں جھلستے دن اور گرد آلود جھکڑوں والی راتیں.....وطن عزیز کے بیشتر میدانی علاقوں میں آج کل موسم کی یہی ادا ہے۔ نیٹو رسد کی بحالی کا فیصلہ پھر درپیش ہے۔ مذاکرات میں تو ویسے بھی ہمارا کوئی ثانی نہیں! اس میدان میں موجودہ ''جمہوری'' رہنماؤں کی کارکردگی سے گزشتہ سالوں کی تاریخ کا ہر موڑ آراستہ ہے۔ اعلانِ واشنگٹن سے لے کر دہشت گردی کی جنگ میں امریکی غلام بننے تک.....ہم اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے پتے کامیابی سے کھیلنے میں انتہائی شرمناک تاریخ رکھتے ہیں۔ جہاں پیش نظر قومی نہیں، ذاتی فائدے ہوں وہاں ترجیحات ہی اور ہو جاتی ہیں۔

یہی معاملہ نیٹو کی رسد کھولنے کا بھی ہے جو سلالہ چوکی پر نیٹو کے بلا جواز اور دانستہ حملے کے بعد بند کر دی گئی تھی۔ ہم تو ابھی تک اپنے ''دوستوں'' کو یوں پیٹھ میں چھرا گھونپنے پر معافی مانگنے پر بھی آمادہ نہ کر سکے۔ اول تو معافی اور رقوم کی ادائیگی کو رسد کھولنے سے مشروط کرنا ہی قرینِ انصاف نہیں کیونکہ رقوم جس خدمت کے بدلے میں ہیں وہ ہم پہلے سے بجالا چکے ہیں اور ''دوستوں'' پر حملہ کر کے رسمی طور پر شرمندگی کا اظہار بھی کرنا رسد کی بحالی جیسے بڑے اقدام کا جواز فراہم نہیں کرتا۔ جبکہ صورتحال یہ ہے کہ شکاگو کانفرنس کے انعقاد کے ساتھ ساتھ ڈرون حملے اسی زور و شور سے جاری ہیں۔ یہاں تک کہ شمالی وزیرستان میں مسجد پر براہ راست حملہ کیا گیا جس سے متعدد نمازی جاں بحق ہوئے۔ آخر دنیا کا کون سا قانون عبادت گاہوں پر حملے کی اجازت دیتا ہے؟

مگر بدقسمتی سے پاکستان ایک ایسا ''اتحادی'' ہے جس کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے کسی بین الاقوامی قانون، اصول، عدالت یا فورم کا لحاظ اور خوف کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا کیونکہ یہاں دھمکی اور لالچ کے بل بوتے پر ہر من پسند کام کروالیا جاتا ہے۔

اٹھارہ کروڑ عوام کی عزتِ نفس چند بے تدبیر ہاتھوں میں ہے، جن کے محل آج بھی جگمگا رہے ہیں جبکہ پورا ملک بجلی کے بدترین بحران میں ڈوبا ہوا ہے۔ چالیس سے اوپر درجہ حرارت اور ہر سطح کے امتحانات کے ان مہینوں میں لوگ لالٹینوں اور ہاتھ کے پنکھوں سے نبرد آزما ہیں، کہ یو پی ایس چارج نہیں ہو پاتے اور پٹرول کی ہوشربا قیمت جنریٹر چلانے کی ہمت نہیں دیتی۔ کاروبار ختم اور فیکٹریاں ملیں بند ہو رہی ہیں۔ پانی کے بحران کا خوف سر پر منڈلا رہا ہے اور ہر سال صورتحال بد سے بدتر

ہورہی ہے۔اگر چہ ترکمانستان سے گیس پائپ لائن کا معاہدہ طے پانے کو ہے اور ایرانی گیس پائپ لائن کا معاملہ بھی ابھی تک زیرغور ہے۔مگر نجانے ابھی کتنے مرحلے باقی ہیں اور کب تک ان کے ثمرات عوام تک پہنچیں گے، جبکہ عوام کی حالت یہ ہے کہ

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک!

ان حالات میں وزیراعظم کا بیان کہ لوگ ملک چھوڑ کیوں نہیں دیتے، زخموں پر نمک چھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔عرض ہے کہ جو ملک چھوڑ سکتے تھے انہوں نے چھوڑ دیا اور بہتیرے چھوڑ بھی رہے ہیں۔مگر کیا ذمہ داری کے سب سے اعلیٰ منصب پر متمکن شخص کو یہی جواب دینا چاہئے اور وہ بھی بین الاقوامی میڈیا پر؟ مصیبتوں میں پسے ہوئے عوام کی ہمت بندھانے کی بجائے جمہوری حکومت کے سربراہ کا یہ جواب نمک پاشی کے سوا اور کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں رہنے والے وہ ہیں جن کی یا تو ملک سے وفاداری اتنی پختہ ہے کہ وہ مشکل حالات کے باوجود ملک چھوڑنا گوارا نہیں کرتے اور یا پھر وہ بھاری اکثریت ہے جن کے پاس اس مٹی کے سوا روئے زمین پر اور کوئی ٹھکانہ نہیں۔گویا ہمارے حکمران ایک طرف تو اپنے عوام کی مجبوری، بے بسی اور غربت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں تو دوسری طرف ان کی اپنے وطن سے وفاداری کا۔جو ان دونوں اقسام میں شامل ہیں، یعنی جن کا صبر جواب دے جاتا ہے یا باہر کوئی ٹھکانہ میسر آجاتا ہے، وہ ان کی بلا سے ملک چھوڑتے جائیں، حکمرانوں کو نہ پہلے اس سے کوئی فرق پڑا ہے نہ آئندہ پڑے گا۔

کراچی پھر بدترین قتل وغارت گری کی زد میں رہا۔ریلی پر فائرنگ سے کئی معصوم جانیں ضائع ہوئیں اور حسب معمول کوئی ایکشن نہ ہوا اور جو ہوا وہ یہ کہ کراچی اور بلوچستان کے حالات ٹھیک کرنے کا جائزہ لینے کے لیے دو کمیٹیاں تشکیل دے دی گئیں۔دونوں جگہوں کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے زیادہ سنگین مذاق اور کوئی نہیں ہوسکتا کیونکہ کمیٹیوں کا انجام پاکستان کی تاریخ میں سب جانتے ہیں۔خانہ جنگی کی سی صورتحال میں کمیٹیاں کیا فیصلے دیں گی!

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک!

دعاگو

صائمہ اسماء

رضیہ خان[1]

تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کیلئے!

التطفیف عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ڈنڈی مارنا یعنی ماپ تول میں کمی کرنا، ملاوٹ کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے والوں کو تباہی و بربادی کی بشارت دی ہے۔

یہ ایک بددیانتی ہے جو اخلاقی جرم ہے اور ایسے جرم پر دنیا و آخرت دونوں میں گرفت ہوگی۔ قرآن پاک میں پوری ایک سورہ نازل فرمائی گئی ہے جس میں اس جرم پر وعید ہے اور اس کا نام بھی اسی پر ہے۔

تولتے وقت دوسرے کیلئے ڈنڈی مار کر چیز کم کر دینا اپنے لیے چیز کو تولتے ہوئے بڑھا دینا یا پیمانہ ہی چھوٹا کر دینا اور ہر طرح کے ہیر پھیر کو قرآن نے سخت حرام و گناہ بتایا ہے۔

شعیب علیہ السلام کی قوم پر صرف اس وجہ سے عذاب نازل ہوا یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ جس کے ارتکاب پر تباہی پھٹکار لعنت اور جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

اور ناپ تول میں پورا پورا انصاف کرو۔

اور حضور ﷺ نے احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فرمایا

تولو اور جھکتا ہوا تولو۔

اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں کسی کو کسی سے شکایت نہیں ہوگی دل صاف ہونگے۔ معاشرے میں امن وسکون اور عدل واحسان ہوگا اللہ کی طرف سے برکت و رحمت عطا ہوگی۔ خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ بدامنی، بے اطمینانی خلش و خوف کا خاتمہ ہوگا۔ اور خوبی یہ کہ عاقبت بھی سنور جائے گی۔ ورنہ دینوی عذاب کے ساتھ ساتھ آخرت کے عذاب کا خوف بھی سر پر سوار رہے گا۔

ملاوٹ کرنے والے لوگوں کیلئے قرآن میں لفظ استعمال ہوا۔ المطففین ...... یعنی ماپ تول میں کمی کرنے والا اور ملاوٹ کرنیوالا۔ عام طور پر ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کا اطلاق صرف دودھ میں ملاوٹ یا ترازو سے چیزوں کے کم تولنے پر ہوتا ہے گویا ایسا کرنے والوں پر جو عذاب ہوگا تو وہ تو گوالے ہوں یا پھر دکاندار جن کا ہمہ وقت کام تولنا اور ماپنا ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کے معانی میں تو بہت وسعت پائی جاتی ہے اور وہ مفاہیم اس میں شامل ہیں کہ جن کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں۔

سب سے پہلے تو نماز ہی کو لیجیے جس کے بارے میں ہم گمان بھی نہیں کر سکتے کہ نماز میں ماپ تول میں کمی کا کیا دخل۔ جب ہم رکوع سجود میں ڈنڈی مارتے ہیں۔ اطمینان کے ساتھ رکوع وسجود نہیں کرتے۔ جلدی جلدی ادا کرتے ہیں صرف ٹھونگے لگانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ رکوع سے اٹھ کر سیدھے کھڑے ہونے سے بیشتر سجدے میں گر جاتے ہیں۔ پہلے سجدے سے تھوڑا سا سر اٹھا کر دوبارہ سجدے میں چلے جاتے ہیں تو یہ بھی نماز میں ڈنڈی مارنے کے مترادف ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ایسے ہی عمل سے رکوع وسجود کا حق ادا نہیں کر رہا تو فرمایا 'لقد طففت' یعنی بے شک تو نے نماز میں ڈنڈی ماری، کیا کبھی ہم نے اس انداز میں نماز کے بارے میں سوچا۔ اب کام کاج اور دفتروں میں جانے کی باری آتی ہے۔ کبھی

---

[1] سابق صدر شعبہ اسلامیات، لاہور کالج برائے خواتین۔

وقت پر نہیں پہنچ پاتے۔ پانچ دس منٹ کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ گھنٹہ گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ لیٹ پہنچتے ہیں۔ پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد گپ شپ اور چائے کا دور چلتا ہے حالانکہ اس کی اجازت کوئی آجر نہیں دیتا۔ گواہ حکومت ہو یا کوئی فرد۔ جتنی دیر تک گپ شپ کی یا چائے کا دور چلا تو کیا یہ کام کی استعداد میں نکمے پن کی ملاوٹ نہ ہوئی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی یہ مثال تو ہم بڑے فخر وانبساط کے ساتھ دیتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک چھوٹی سی ذاتی بات کرتے وقت سرکار کا دیا بجھا دیا۔ مگر خود عمل پیرائی ۔۔ د۔ سرکاری اشیاء، کاغذات پن، پنسل، دیگر وسائل جیسے کاریں، پٹرول، ٹیلیفون اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں اپنا ذاتی حق سمجھ کر استعمال کی جاتی ہیں اور خوب خوب استعمال کی جاتی ہیں چھوٹے سرکاری ملازمین کو اپنا ذاتی ملازم بنا لیا جاتا ہے۔ ایسے افسران بڑے دھڑلے سے گوالے سے تو کہیں گے ملاوٹ مت کیا کرو مگر اپنی نااہلی کو اہلیت کے ساتھ خلط ملط کرتے ہوئے کوئی جھجک نہیں۔ کوئی عار نہیں بلکہ کوئی احساس ہی نہیں۔ تو سرکاری افسران کے دل میں دشمن کا خوف کیونکر نہ ہوگا۔ کیوں نہ وہ بھارت اور امریکہ کے سامنے سرنگوں ہونگے۔

حدیث کا مفہوم ہے کہ جس قوم میں مال غنیمت لوٹا جاتا ہے اس کے دل میں دشمن کا رعب ڈال دیا جاتا ہے۔

پیشہ معلّمی نہایت معزز پیشہ ہے مگر ملاوٹ کا دھندہ یہاں بھی جاری ہے۔ وقت مقررہ سے لیٹ جانا جلدی آ جانا، کلاس میں اپنے گھر اور بچوں کی کہانیاں بیان کرتے رہنا۔ اپنی اولادوں کی فتوحات کا تذکرہ، لیکچر یا سبق کی تیاری ۔۔ د، گئے کتاب اٹھائی، ریڈنگ کی اور آ گئے۔ کسی نے سوال پوچھ لیا تو اسے سخت سخت سنا کر چپ کرا دیا کہ جواب تو خود کو بھی معلوم نہیں ہوتا۔ لہٰذا استادی دکھائی ڈانٹ کر چپ کرا دیا۔

سٹوڈنٹس بھی اسی ملاوٹ کا شکار ہیں۔ کالج یا سکول جانے کیلئے تو خوب تیاری کی مگر کلاس میں جانے کی کوئی تیار نہیں۔ آئندہ کا سبق کیا ہے کچھ معلوم نہیں کلاسز چھوڑیں گراؤنڈ میں بیٹھ کر گپ شپ لگائی۔ سموسے آئس کریم کھائی۔ حالات پر تبصرہ کیا، ذمہ داری ختم۔ نہ ماں باپ کے لگائے گئے پیسے کی پروا نہ مستقبل کا فکر۔

تجارت کو لیجیے پارٹنر شپ قائم کی۔ کچھ عرصہ معاملات درست چلتے رہے۔ اب نیت میں فتور پیدا ہوا ساتھی کے حصے میں تخفیف شروع کر دی۔ منافع میں تاخیری حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ ڈنڈی مار کر پیسے میں کمی کر دی۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ منہ چھپائے پھر رہا ہے۔ اس کے بعد انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے۔ اصل زر ہڑپ، منافع غائب، حتیٰ کہ پارٹنر بھی غائب۔ اگر یہ ملاوٹ نہیں تو اور ملاوٹ کسے کہتے ہیں۔

مزدور کو مزدوری پر لگایا۔ کام وقت سے زیادہ لیا اور مزدوری میں ہیر پھیر کیا۔ مزدور سے بار بار پھیرے لگوائے۔ حساب کرنے کا وعدہ کیا مگر وقت پر حساب کر کے نہ دیا۔ حدیث تو یہ ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرو بلکہ کچھ زیادہ دے کر احسان کا سلوک کرو کہ

ان اللہ یحب المحسنین۔

اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

ذرا سوچیے جو قوم بدعہدی کرتی ہے اللہ اس پر دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

ایک بیوی شوہر سے حقوق سے بھی زیادہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ خواہ اس کیلئے اسے بد دیانتی، رشوت اور غصب کا سہارا کیوں نہ لینا پڑے اور شوہر وہ تو خدائے مجازی ہے اور بیوی لونڈی سے بھی بدتر اس کے تو کوئی حقوق ہی نہیں فرائض ہی فرائض ہیں۔ شوہر کے والدین بہن بھائی بھی بیوی سے بدسلوکی کے حقدار ہیں اور یا معاملہ اس کے بالکل برعکس شواہد کے والدین اور بہن بھائیوں کے حقوق نہیں تمام تر حقوق بیوی کے رشتہ داروں کے ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کے حقوق کی وضاحت کر دی ہے۔ اور اگر خداوند کریم کے بتائے ہوئے حقوق و فرائض پر عمل کیا جائے تو گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔

والدین کی ذمہ داریاں ہی ذمہ داریاں بچپن میں پالیں پوسیں

پڑھائیں، کھلائیں، پلائیں، پہنائیں، اچھی تعلیم و تربیت دیں، شادیوں کے بے پناہ اخراجات برداشت کریں، بچوں کے گھر بسا کر خود فارغ ہو جائیں۔ان کے کیا حقوق ہیں؟ بس ہماری زندگیوں میں مداخلت سے باز رہیں۔ ہمارے گھر تباہ ہو رہے ہیں حالانکہ اگر والدین اور اولاد دونوں ہی اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کی پاسداری کریں تو نہ صرف یہ کہ بہترین معاشرہ تیار ہو گا بلکہ جو انسان اس تربیت کے نتیجے میں تیار ہونگے لاجواب ہونگے۔

گھریلو ملازمین کو لیجیے۔ بدعہدی تو ان کی سرشت میں ہے۔ وعدہ ایک سے کرنا، کام دوسری جگہ پر کر لینا۔مطالبات ہی مطالبات کوئی حد ہی نہیں۔جھوٹ بولے بغیر تو گزارا ہی نہیں گھر کے اندر کے راز ہر وقت پھیلانے پر تیار۔گھر کی عزت پر ہر وقت نقب لگانے کو تیار۔ ہر طرح کے گناہ پر عمل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں ہر گناہ کی ملاوٹ پر خوش رہتے ہیں۔

ہمسایوں کے بے پناہ حقوق ہیں حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ ہمسائے کو کہیں وارث جائیداد تو نہیں ٹھہرایا جا رہا ہے۔اور ہم آپ ﷺ کی امت قطعی طور پر ان حقوق سے لاعلم۔

رشتہ داروں کے کیا حقوق ہیں نہیں جانتے، رشتہ داروں کو اذیت دینے کیلئے ہر وقت چوکس، ان کو بدنام کرنے کیلئے تاک میں ہوتے ہیں۔تہمتیں لگانا عیب لگانا طعنے دینا تو ہم بھولتے ہی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حقوق العباد اور حقوق اللہ کو بھی نہایت دیانتداری سے ادا نہ کرنا اور اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کرنا سب مطففین کے زمرے میں آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو انفرادی و اجتماعی اور قومی حیثیت سے اپنی اپنی ذمہ داریاں نہایت دیانتداری سے ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے.....آمین ثم آمین.....

☆☆☆

ذرائع ابلاغ کے ذریعے دنیا پر قبضہ کا خواب

1898ء میں سوئٹزر لینڈ کے شہر بال میں تین سو یہودی دانشوروں، مفکروں، فلسفیوں نے ہرٹزل کی قیادت میں جمع ہوکر پوری دنیا پر حکمرانی کا منصوبہ تیار کیا۔ یہ منصوبہ 19 پروٹوکولز کی صورت میں پوری دنیا کے سامنے عرصہ ہوا آچکا ہے۔ اس منصوبے کو یہودی دانشوروں کی دستاویز بھی کہتے ہیں۔ اس پورے منصوبے میں 30 یہودی انجمنوں کے ذہین ترین لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ اس دستاویز میں ذرائع بلاغ کو بنیادی اہمیت دی گئی۔ بارہویں دستاویز میں صحافت کی غیر معمولی اہمیت، اس کی تاثیر و افادیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

اگر ہم یہودی پوری دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کیلئے سونے کے ذخائر پر قبضے کو مرکزی اور بنیادی اہمیت دیتے ہیں تو ذرائع بلاغ بھی ہمارے مقاصد کے حصول کیلئے دوسرا اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ہم میڈیا کے سرکش گھوڑے پر سوار ہوکر اس کی باگ کو اپنے قبضے میں رکھیں گے۔ ہم اپنے دشمنوں کے قبضے میں کوئی ایسا موثر اور طاقتور اخبار نہیں رہنے دیں گے کہ وہ اپنی رائے کو موثر ڈھنگ سے ظاہر کرسکیں۔ اور نہ ہی ہم ان کو اس قابل رکھیں گے کہ ہماری نگاہوں سے گزرے بغیر کوئی خبر سماج تک پہنچ سکے۔ ہم ایسا قانون بنائیں گے کہ کسی ناشر اور پریس والے کیلئے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی چیز چھاپ سکے۔ اس طرح ہم اپنے خلاف کسی بھی سازش یا معاندانہ پروپیگنڈے سے باخبر ہوجائیں گے۔ ہم ایسے اخبارات کی سرپرستی کریں گے جو انتشار و بے راہ روی اور جنسی و اخلاقی انارکی کو پھیلائیں گے اور استبدادی حکومتوں اور مطلق العنان حکمرانوں کی مدافعت اور حمایت کریں گے۔ ہم جب چاہیں گے قوموں کے جذبات کو مشتعل کریں گے اور جب مصلحت دیکھیں گے انہیں پرسکون کردیں گے۔ اس کیلئے سچی اور جھوٹی خبروں کا سہارا لیں گے۔ ہم ایسے اسلوب میں خبروں کو پیش کریں گے کہ قومیں اور حکومتیں ان کو قبول کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ ہمارے اخبارات و رسائل ہندوؤں کے معبود وشنو کی طرح ہوں گے جس کے سینکڑوں ہاتھ ہوتے ہیں۔ ہمارے پریس کا یہ بنیادی کام ہوگا کہ وہ مختلف موضوعات اور کالموں کے ذریعے رائے عامہ کی نبض پر ہاتھ رکھیں گے۔ ہم یہودی ایسے مدیروں، مالکان اور نامہ نگاروں کی ہمت افزائی کریں گے جو بدکردار ہوں گے اور ان کا ریکارڈ مجرمانہ ہو۔ ہمارا یہ معاملہ بدعنوان سیاست دانوں، لیڈروں اور مطلق العنان حکمرانوں کے ساتھ ہوگا جن کی ہم خوب تشہیر کریں گے۔ ان کو دنیا کے سامنے ہیرو بنا کر پیش کریں گے لیکن ہم جیسے ہی محسوس کریں گے کہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکلے جارہے ہیں تو فوراً ہم ان کا کام تمام کردیں گے تاکہ دوسروں کیلئے عبرت ہو۔ ہم یہودی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ خبر رسال ایجنسیوں کو زیر کنٹرول رکھ کر دنیا کو جو کچھ دکھانا چاہتے ہیں وہ دنیا کو دیکھنا ہوگا۔ جرائم کی خبروں کو ہم غیر معمولی اہمیت دیں گے تاکہ پڑھنے والوں کا ذہن اس انداز سے تیار ہوسکے کہ دیکھنے والے کو مجرم سے ہمدردی ہوجائے۔

عالمی خبر رساں ایجنسیاں

ذرائع بلاغ اور خبر رساں ایجنسیوں کے درمیان وہی تعلق ہے جو بندوق اور کارتوس کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر کارتوس فراہم نہ ہوتوں تو بندوق کا وجود بے کار ہے۔ یہودیوں نے اخبارات و رسائل کے ساتھ خبر رساں ایجنسیوں کے قیام کی طرف بھی خصوصی توجہ دی یہی وہ بنیادی ذریعہ ہے جس کے استعمال سے اپنی خواہش کے مطابق وہ

کام کرتے ہیں۔

یہودیوں کے پروٹوکول کے بارہویں باب کی یہ تحریری غور سے پڑھیں جس میں کہا گیا ہے کہ ہماری اجازت کے بغیر کوئی اور ادنیٰ سے ادنیٰ خبر کسی سماج تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس بات کو یقینی بنانے کیلئے ہم خبر رساں ایجنسیاں قائم کریں گے۔ اس کی روشنی میں یہودیوں نے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا اور خبر رساں ایجنسیاں قائم کیں جو درج ذیل ہیں۔

رائٹرز:

عالمی خبر رساں ایجنسیوں میں رائٹر کو غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ دنیا کے تمام اخبارات اور ٹی وی اس ایجنسی کی خبروں پر بھروسا رکھتے ہیں حتیٰ کہ بی بی سی، وائس آف امریکہ، ریڈیو مونٹ کارلو بھی اس سے 90 فیصد خبریں حاصل کرتے ہیں۔ اس خبر رساں ایجنسی کا بانی جولیس 1816ء میں یہودی خاندان میں پیدا ہوا۔ 1851ء میں لندن میں اس ایجنسی نے اپنا کام شروع کیا۔ 1857 میں رائٹر ایجنسی کے مالک کو برطانوی شہریت دے دی گئی اور ایک بڑے خطاب سے ملکہ برطانیہ نے اس کو سرفراز کیا۔ رائٹر کے کارکنوں کی تعداد 3 ہزار کے قریب ہے جس میں ایک ہزار ایڈیٹر اور صحافی و نامہ نگار ہیں۔ اس نیوز ایجنسی کے نصف سے زائد کارکن برطانیہ کے باہر غیر ملکیوں میں کام کرتے ہیں۔ 75 سے زائد مرکز کے ذریعے ایک سو پچاس ملکوں کے اخبارات و رسائل، ریڈیو، ٹی وی، کمپنیوں کو اور روزانہ پندرہ لاکھ الفاظ پر مشتمل خبریں اور مضامین بھیجے جاتے ہیں جو 48 زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔

یونائیٹڈ پریس:

1907ء میں امریکہ کے دو یہودی سرمایہ داروں اسکرپٹس اور ہوارڈ نے یونائیٹڈ پریس کے نام سے ایک خبر رساں ایجنسی کی بنیاد ڈالی اور دو سال بعد انٹرکھٹکنی نیوز سروس کے نام سے کمپنی قائم کی جو بعد میں عالمگیر اشاعتی ادارے میں تبدیل ہوگئی۔ اور اس کی شاخیں دنیا بھر میں پھیل گئیں۔ ولیم ہیرسٹ اگرچہ عیسائی تھا لیکن اس کی شادی ایک بڑے یہودی سرمایہ کار لڑکی سے ہوئی۔ ولیم ہیرسٹ کا پورا خاندان یہودی خاندان میں تبدیل ہوگیا۔ اس کے بعد یونائیٹڈ پریس اور انٹرکھٹکنی پریس دونوں آپس میں ضم ہوکر نیویارک ٹائمز کی ملکیت میں آگئے جو ایک یہودی کے ماتحت ہے۔ 1982ء میں ان سب کو میڈیا نیوز کارپوریشن میں ضم کردیا گیا۔

یونائیٹڈ پریس انٹرکھٹکنی سے امریکہ میں گیارہ سو پچاس اخبارات پبلشنگ ادارے اور تین ہزار ایک سو ننانوے ریڈیو اور ٹی وی سٹیشن وابستہ ہیں۔ پوری دنیا میں اس ایجنسی کے ایک سو ستر دفاتر ہیں۔ صرف امریکہ کے اندر 96 دفاتر ہیں۔ یو پی آئی میں دو ہزار افراد کام کرتے ہیں۔ جس میں بارہ سو ایڈیٹر اور کیمرہ مین ہیں۔ سات سو نامہ نگار امریکہ سے باہر مختلف ملکوں میں متعین ہیں۔

فرانسیسی نیوز ایجنسی اے ایف پی

1835ء میں فرانس کے ایک یہودی خاندان ہاوا نے ہاواس نیوز ایجنسی کے نام سے ایک خبر رساں ادارے کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر ایجنسی فرانس پریس کے نام سے مشہور ہوا۔ اگرچہ فرانس میں صرف 7 لاکھ یہودی ہیں لیکن وہاں پر شائع ہونے والے پچاس فیصد اخبارات و رسائل پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ فرانسیسی نیوز ایجنسی کی نئی تنظیم مارچ 1957ء میں کی گئی جس کے مطابق اس کا دائرہ کار فرانس سے باہر تک بڑھا دیا گیا۔ اس ایجنسی میں 1000 کے قریب صحافی کام کرتے ہیں جس میں 3 سو کے قریب صحافی فرانس کے باہر متعین ہیں۔ اس نیوز ایجنسی کے ماتحت 12 نیوز ایجنسیاں کام کرتی ہیں۔ ایک سو پچاس ریڈیو ٹی وی اداروں کو یہ ایجنسی خبریں مہیا کرتی ہے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس

1848ء میں امریکہ کے پانچ بڑے روزناموں نے مل کر ایسوسی ایٹڈ پریس کے نام سے خبر رساں ایجنسی کی بنیاد ڈالی۔ 1900ء میں یہ ایجنسی عالمگیر کمپنی کی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ اس کمپنی میں 90 فیصد

سرمایہ یہودی سرمایہ کاروں کا ہے۔اس ایجنسی سے 1600 روزنامے اور 4 ہزار ایک سو اٹھاسی ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن وابستہ ہیں۔اس نیوز ایجنسی کے امریکہ میں ایک سو سترہ دفاتر اور بیرونی ممالک میں 81 اخباری مراکز ہیں جہاں 7 سو نامہ نگار متعین ہیں۔ان میں 30 نامہ نگار امریکی ہیں

پانچ بڑی میڈیا کمپنیاں

دنیا میں پانچ بڑی میڈیا فرمیں ہیں۔ پہلے نمبر پر والٹ ڈزنی آتی ہے۔اس کا چیف ایگزیکٹو مائیکل ایزنر نام کا ایک یہودی ہے جب کہ اس کے سارے ڈائریکٹرز، پروڈیوسرز، منیجرز اور جنرل منیجرز یہودی ہیں۔اس کمپنی کے پاس 3 بڑے ٹیلی ویژن چینلز ہیں۔اے بی سی دنیا میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا کیبل نیٹ ورک ہے۔ صرف امریکہ کے اندر اس کیبل نیٹ ورک کے ایک کروڑ چالیس لاکھ کنکشن ہولڈرز ہیں۔ یہ کمپنی دو ریڈیو پروڈکشن کمپنیوں، فلمیں بنانے والی دنیا کی تین بڑی کمپنیوں، آرٹ کے دو ٹیلی ویژن چینلز، 11 اے ایم ریڈیو اور ایف ایم ریڈیو چینلز کی مالک ہے۔اور دنیا میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا اسپورٹ چینل بھی ای ایس پی این بھی اسی کمپنی کی ملکیت ہے۔

دنیا کے 225 ٹیلی ویژن چینلز والٹ ڈزنی کمپنی سے وابستہ ہیں۔دنیا کے تین ہزار 4 سو ریڈیو اس سے وابستہ ہیں۔

دوسری بڑی میڈیا کمپنی ٹائم وارنر ہے جس میں کام کرنے والے تمام چھوٹے بڑے عہدیدار یہودی ہیں۔ ٹائم وارنر پر دنیا میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا فلموں کا چینل ایچ بی او، میوزک کا سب سے زیادہ دیکھا جانے والا چینل وارنر میوزک، ایک ویڈیو پروڈکشن کمپنی اور دنیا کے 5 کثیر الاشاعت میگزین ٹائم، اسپورٹس، السٹریٹڈ، پیپل اور فارچون ہیں۔ وایا کام پیراماؤنٹ دنیا کی تیسری بڑی میڈیا فرم ہے۔ یہ سر ریڈ اسٹون نامی یہودی کی ملکیت ہے۔اس میں بھی تمام ملازمین یہودی ہیں۔ دنیا بھر کے نوجوان سب سے زیادہ ایم ٹی وی اور بچے Nickelodean نامی چینل دیکھتے ہیں۔امریکہ میں کالے اور گورے امریکی ایشیائی کی تفریق کی بنیاد انہوں نے رکھی جنہوں نے تہذیبوں کا تصادم کی تھیوری دی۔جنہوں نے دنیا کو مغرب اور مشرق میں تقسیم کیا۔ ہر فرم ہر سال 10 ارب ڈالر کماتی ہے۔اس کے پاس ریڈیو کے 12، ٹیلی ویژن کے 13 چینلز ہیں۔ یہ کتابیں شائع کرنے والے تین بڑے اداروں اور ایک فلم ساز ادارے کی بھی مالک ہے۔

چوتھی بڑی کمپنی نیوز کارپوریشن ہے جس کا مالک بھی یہودی ہے۔ یہ بھی بے شمار ٹی وی چینلز اور رسائل کی مالک ہے اس کمپنی میں یہودیوں کے علاوہ اور کسی کو کام نہیں ملتا۔

پانچویں نمبر پر جاپان کی کمپنی سونی ہے۔ یہ کمپنی بھی فلمیں بناتی ہے ٹیلی ویژن اور ریڈیو چینلز چلاتی ہے۔گو اس وقت اس میں زیادہ تر عملہ جاپانیوں پر مشتمل ہے لیکن یہودی لابی اسے خریدنے کیلئے پورا زور لگا رہی ہے۔اس وقت جاپان میں صرف دو ہزار یہودی آباد ہیں۔ان میں سے ایک ہزار یہودی کسی نہ کسی شکل میں میڈیا سے وابستہ ہیں۔

یہودی پرنٹ میڈیا کو کس قدر عزیز سمجھتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ ایک ایک یہودی فرم 50,50 اخبارات اور میگزین شائع کر رہی ہے۔ نیو ہاؤس یہودیوں کی ایک اشاعتی کمپنی ہے جو 26 روزنامے اور 245 میگزین شائع کرتی ہے۔

امریکہ میں یہودیوں کے مشہور روزنامے اور میگزین ہیں جنہوں نے پرنٹ میڈیا پر قبضہ کر رکھا ہے۔

روزنامہ وال سٹریٹ جنرل، نیویارک ڈیلی نیوز، نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ دنیا کے بڑے اخبارات ہیں جن کی روزانہ اشاعت 90 لاکھ سے زائد ہے۔ ان اخبارات کو صحافتی دنیا میں اسٹوری میکر کہا جاتا ہے۔ان اخبارات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کو سٹوری دیتے ہیں۔مشہور میگزین جو امریکہ کے علاوہ پوری دنیا میں پڑھے جاتے ہیں ریڈرز ڈائجسٹ، ٹائمز میگزین، پہلے ہوائے، بزنس ویک جن کی اشاعت 2 کروڑ سے زیادہ ہے۔ یہ میگزین وہ

ایشوز چھیڑتے ہیں جو آگے چل کر دنیا بھر کے اخبارات کیلئے خبر بنتے ہیں۔ ان میگزین اور اخبارات کو پوری دنیا میں تقسیم کرنے کی 1770 ایجنسیاں اور پبلشنگ ادارے ہیں ان سب پر یہودی قابض ہیں۔

• یہی طور پر پورے امریکہ میں 140 ٹی وی چینلز یہودی ملکیت میں ہیں۔ دوسری طرف روزانہ 65 ملین سے زائد جو امریکی روزنامہ تقسیم ہوتے ہیں ان میں 62 ملین کے مالک یہودی ہیں۔ جب کہ امریکہ میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب صرف 2.9 فیصد ہے۔

امریکی میڈیا کے متعلق امریکیوں کی رائے

امریکی عوام کی اکثریت اس یہودی میڈیا کے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہے۔ یہ روزنامہ لاس اینجلس ٹائمز کے ایک سروے سے معلوم ہوتا ہے جو جولائی 1999ء میں کرایا گیا تھا۔

50 فیصد امریکی اپنے میڈیا پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ مالکوں کے نقطہ نظر کی حمایت و مطابقت نہیں رکھتے۔

70 فیصد امریکیوں کا کہنا ہے کہ امریکی میڈیا دولت مندوں اور اصحاب ثروت کے اثر ونفوذ کی حمایت کرتا ہے اس میں کو دامریکی حکومت بھی شامل ہے۔

70 فیصد امریکیوں کا کہنا ہے کہ امریکی میڈیا کی خبروں میں عدم توازن اور جانب داری پائی جاتی ہے۔

60 فید امریکی فحاشی اور عریانی سے متعلق خبروں اور تصویروں اور کہانیوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

45 فیصد امریکیوں کا کہنا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی خبریں من گھڑت ہوتی ہیں۔

60 فیصد امریکی خبریں سی بی ایس، بی سی اور اے بی سی سے حاصل کرتے ہیں۔

52 فیصد امریکی روزناموں سے خبریں حاصل کرتے ہیں۔

80 فیصد خبریں سی این این سے حاصل کرتے ہیں۔

ہالی ووڈ

ہالی ووڈ جو فلم سازی کا سب سے بڑا مرکز ہے اور پوری دنیا کو وہیں سے فلمیں برآمد کی جاتی ہیں تمام سینما کمپنیوں کے مالک یہودی ہیں۔

سینما کمپنیوں کے نام	یہودی مالک
فوکس کمپنی	ولیم فوکس
گولڈ کمپنی	سموئیل گولڈن
میٹرو کمپنی	مونسی مائبر
وارنر برادر اینڈ کمپنی	ہارنی وارنر
پیراماؤنٹ کمپنی	بڈ کنس

ان کمپنیوں میں اداکار، مکالمہ نگار، کیمرہ مین ڈائریکٹر سب یہودی ہیں۔

انڈیپینڈنٹ نیوز کے ایڈیٹر نے 1938ء میں لکھا تھا کہ امریکی سینما کی صنعت کے یہودی بلاشرکت غیرے مالک ہیں۔ اس صنعت میں کام کرنے والے سب یہودی ہیں۔ ان یہودی فلم ساز کمپنیوں کی فلمیں نہ صرف وسطی بلکہ پوری دنیا میں سپلائی کی جاتی ہیں فورڈ نے یہودیوں کی زیرنگرانی بنائی جانے والی فلموں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فنکاری جذبات کی عکاسی اور سماجی مشکلات و مسائل کی تصویر کشی سے ان فلموں کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ سولہ سال سے اٹھارہ سال کی عمر کے نوجوانوں کے دل ودماغ کو کس طرح برباد کیا جائے۔ اس لیے سارا زور شہوانی جذبات کو بھڑکانے اور معاشرے کی اخلاقی قدروں کے خلاف بغاوت پر ہوتا ہے۔ فورڈ آگے لکھتا ہے کہ پہلا بنیادی نصب العین زیادہ سے زیادہ منافع کا حصول، اس کے بعد غیر یہودیوں کی تباہی و بربادی خصوصا بیتی نوں اور عربوں کے خلاف منفی پروپیگنڈہ ہے۔ (اس حوالے سے ہم آگے تفصیل سے بات کریں گے) اس کے علاوہ فیشن کی وہ چیزیں تیار کرتے ہیں جن کو معاشرے میں فروغ دینے کا ان کا منصوبہ ہے تاکہ فلم دیکھنے والے اداکاروں کے فیشن اور طرز زندگی کے مطابق مارکیٹ سے مطلوبہ اشیاء فراہم کریں۔ اس طرح پورا انسانی معاشرہ یہودیوں کی چشم ابرو پر چلنے کیلئے اپنے کو مجبور پاتا ہے اور ان یہودی اداکاروں

کے فیشن اور طرز زندگی کو اختیار کرنے ہی کو وقت کا سب سے بڑا تقاضا سمجھتا ہے۔

امریکی اخبار انڈیپنڈنٹ کرسچین نیوز نے امریکی فلموں پر یہودی اجارہ داری اور غلبے کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہالی ووڈ نہ صرف ہر طرح کی برائیوں کا مرکز ہے بلکہ اس نے مردوں سے ان کی مردانگی اور عورتوں سے ان کی نسوانیت چھین لی ہے۔ مجرم اور بدکار لوگوں کو ڈھالنے کے اس کارخانے کو بند کر دینا چاہیے۔

برطانوی صحافت یہودیوں کے شکنجے میں

برطانیہ کی سیاسی اور سماجی زندگی میں یہودیوں کا عمل دخل بہت قدیم ہے۔ برطانیہ کا وزیراعظم ڈزرائیلی اور برطانوی افواج کا چیف آف اسٹاف دونوں بیک وقت یہودی تھے۔ اس سے برطانیہ میں یہودیوں کی حکمرانی اور غیر معمولی اثر ونفوذ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ برطانیہ کے معروف ادارے بی بی سی کے سربراہ مسلسل تین دہائیوں سے یہودی چلے آ رہے ہیں۔ سٹار ٹی وی بھی یہودیوں کی ملکیت ہے۔

رابرٹ مروخ ایک دولت مند یہودی خاندان میں آسٹریلیا میں پیدا ہوا۔ رابرٹ اس وقت عالمی ذرائع ابلاغ کی مملکت میں شہنشاہ کی حیثیت سے یاد رکھا جات اہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ کا بادشاہ اور نیوز کارپوریشن کا صدر ہے۔ جس کا اثاثہ 90 ملین ڈالر ہے۔ گزشتہ سال اس کی آمدنی ساڑھے اڑسٹھ ملین ڈالر تھی۔ ایک سو پچیس روزناموں کا مالک ہے جن کی ہفتہ میں چار سو کروڑ کاپیاں شائع ہوتی ہیں۔ صرف لندن ٹائمز، سنڈے ٹائمز اور سن کے قارئین کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ 1989ء میں رابرٹ نے فوکس نیٹ ورک کو خرید لیا۔ اس کے علاوہ اسکائی ٹیلی ویژن کمپنی اور اسٹار ٹی وی کے بڑے حصے کا مالک ہے۔ اسکائی کی قیمت 5 سو ملین اور سٹار ٹی وی کے حصص کی قیمتوں کا اندازہ پانچ کھرب ڈالر ہے۔ برطانیہ سے شائع ہونے والے درج ذیل اخبار یہودیوں کی ملکیت ہیں۔

ڈیلی ایکسپریس، نیوز کرانیکل، ڈیلی میل، ڈیلی ہیرالڈ، مانچسٹر گارجین، ایوانگ اسٹنڈرڈ، ایوننگ نیوز، آبزرور، سنڈے ریویو، سنڈے ایکسپریس، سنڈے کرانیکل، دی سنڈے پیپل، سنڈے ڈسپیچ، دی اسکاچ، دی ایمپسبیڈ، دی جیوگرافک، ان کی یومیہ اشاعت 33 ملین ہے۔ برطانوی صحافت امریکی صحافت کی طرح یہودیوں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے جو ملکوں کی پالیسی پر بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

امریکی دانشور کا یہودیوں پر تبصرہ

عالمی خبر رساں نیوز ایجنسیوں کے ذریعے یہودی تمہارے دل و دماغ کو دھو رہے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق دنیا کے حالات و حوادث کو دیکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ واقعی حقائق اور حوادث کیا ہیں اور دوسری طرف فلموں کے ذریعے ہمارے نوجوانوں اور فرزندان قوم کے دلو دماغ کو اپنے افکار و خیالات کی مسلسل غذا پہنچا رہے ہیں تاکہ ہمارے بچے جوان ہو کر ان یہودیوں کے دم چھلے اور غلام بن جائیں اور یہ صرف دو گھنٹے کے قلیل وقفے میں۔ اس وقفے میں یہودی شاطر، فلموں کے ریلے ہماری نوجوان اور ابھرتی ہوئی نسل کی عقل اور کردار کو مٹا کر رکھ دیتے ہیں۔ وہی عقل اور کردار جس کی تیاری میں مہینوں اور سالوں اساتذہ اور مربیوں نے صرف کیے تھے۔

(امریکی دانور ارڈیان آرکنڈ.....دی نیویارکر 1937-11-31)

میڈیا پر بیتے نوں کی منفی شکل

ہالی ووٹ فلمی صنعت جو مکمل یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ یہودیوں نے اسلام اور بیتے نوں کے خلاف فلمیں بنا کر اسلامی معاشرت، ثقافت، روایات اور بیتے نوں کی مقدس شخصیات کو نشانہ بنایا ہے۔ بیتے نوں کو ڈاکو، چور، دہشت گرد، شہوت پرست اور دولت کا پجاری بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی واقعات کے تناظر میں لکھی جانے والی کہانیوں پر بننے والی وہ فلمیں جن میں انبیائے کرام اور دیگر مشاہیر اسلام کے کرداروں کو دانستہ طور پر مسخ کرنا اور ان کی توہین کی ناقابل معافی جسارت کا شرمناک ارتکاب۔ ایسی قابل مذمت اور دل آزار فلموں کی اگر تفصیلی فہرست یا رپورٹ مرتب کی جائے تو اس کیلئے سینکڑوں صفحات درکار ہیں۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

مگر بتاؤ.....

سمیٹ سکتا ہوں
ایک پل میں تمہیں صنم میں
چمکتے تاروں کی سرمئی چاندنی کی لو میں
یہ اس کا دعویٰ مرے جنوں کے عمیق گوشوں میں جاگتا ہے
کہا تھا میں نے اسے اسی دم
یہ میرے الفاظ تھے بتاؤ
بتاؤ؟ کیا کر سکو گے تم مجتمع ٹوٹے یہ روح و دل کے
فقط یہ چہرے پہ بکھرے بالوں کی لٹ نہیں ہے
جو اپنے ہاتھوں میں بھر کے
ماتھے سے پیچھے کر دو گے
گھاس پر بکھری شبنمی نرم پتیاں ہیں
یہ نرم و نازک
کہ جن کی جانب اس آفتابی کرن کو بھی
دیکھنے سے پہلے
دراز شب کاٹنی پڑی ہے
یہ کونپلیں ہاتھ تک کی سختی نہ سہہ سکیں گی
اگر کبھی کانچ کے یہ ریزے
جو ذات کی ٹوٹ پھوٹ میں
گرد و پیش میرے بکھر چکے ہیں
جو مجھ کو پاؤں زمیں کی تہہ پر اتارنے
سے بھی روکتے ہیں
یہ کانچ کے ریزے چن سکو گے
لہو کی آواز سن سکو گے.....؟
کہ زخمی ہو جاؤ گے کہیں تم بھی ساتھ میرے
اور اب وہ اکثر ہی
اپنے زخموں سے کھیلتا ہے

رخشندہ نوید

غزل

کیا غنچہ و گل میں کوئی تاثیر نہیں ہے
ذوق اپنا جہاندار و جہانگیر نہیں ہے

حالاتِ زمانہ تو بدلتے ہی رہیں گے
ہاں وقت کسی شخص کی جاگیر نہیں ہے

سب طرزِ سلف چھوڑ کے بدحال بنے ہم
اب بیٹھ کے کہتے ہیں کہ تدبیر نہیں ہے

انسان فقط بندۂ تقدیر ہی بن جائے
یہ بات کبھی باعثِ توقیر نہیں ہے

پھر معرکۂ زیست میں سرگرم عمل ہو
کس نے کہا تو صاحبِ شمشیر نہیں ہے

کیوں امرِ مقدر سے پریشان ہو شہودؔ آج
تقدیر تو خود تابعِ تقدیر نہیں ہے

شہود ہاشمی

نصرت یوسف

اعجاز

فٹ پاتھ کے ساتھ لگی اپنی دکان کی سیڑھی پر بیٹھا میروز کسی مشہور رومانوی گانے کی دھن پر سیٹی بجاتے ہوئے بڑی دلجمعی سے آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اور بات تھی کہ اس کی نگاہیں قدرتی وطبعی قوانین کے تحت رہ رہ کر جنس مخالف پر ٹھہر جاتی تھیں۔ جتنا پرکشش سراپا ہوتا اتنی ہی دیر نگاہ بھی پلٹنے میں لگاتی۔ یہ دورانیہ منٹ بھر سے لے کر حد نگاہ تک اس کو دیکھنے پر منحصر تھا۔ بازار میں اکثر نظر آنے والی خواتین، دوشیزاؤں اور بچیوں کے خدوخال سے وہ خوب واقف ہو چکا تھا۔ زنانہ ملبوسات میں بلاک اور طرح طرح کی پرنٹنگ کا خاصا رواج ہونے کی بنا پر اس کا خواتین سے دن رات ہی واسطہ پڑتا تھا۔ گو ہر ایک کو اس کی نظروں سے شکایت ہو جاتی تھی، لیکن بازار میں اپنے کام میں بہترین ہونے کی بنا پر وہ خاصا معروف تھا۔ اس جیسے پرنٹنگ میں طاق کاریگر کم کم ہی ہوتے ہیں۔

عورتیں اس کی نگاہوں سے جز بز ہوتیں مگر پہناووں کی کشش ان سے سب کچھ برداشت کروا دیتی۔ ''توبہ دیکھتا کیسے ہے!'' بیگم ایاز مدنی اپنے دلکش مہکتے سراپا پر دوپٹہ کندھوں سے نیچے ڈھلکاتے ہوئے اپنے ساتھ موجود خاتون سے اکثر ہی سرگوشی کرتیں تو وہ مسکرانے لگتیں۔

''کام لاجواب کرتا ہے ورنہ میں تو اس کو دیکھوں بھی نہیں، بہت ہی فضول باتیں کرتا ہے''

رمشا صفدر بھی جب جب میروز سے کچھ کام کرواتی تو گھر آ کر کم وبیش ایسا ہی تبصرہ کرنا نہ بھولتی۔ اس کی سنہری دمکتی رنگت ناگواری سے دہکنے لگتی تھی جب وہ اس قسم کے جملے بولتا ''مس! آپ اس میں قسم سے ماڈل لگیں گی''

''میڈم جی یہ غونہ تو بس آپ پر ہی جچے گا''

اس کی باتوں پر کوئی تاثر ظاہر کیے بغیر وہ اپنے بالوں میں ٹکے ڈیزائنر سن گلاسز ناک پر لگاتے ہوئے دکان سے باہر آ جاتی۔ اس کے خوبصورت ہاف سلویز سے باہر بازو میں پہنا ہوا چین نما بریسلٹ اور اس میں چھوٹے چھوٹے دل جھولتے ہوئے میروز کو ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ کر دیتے۔

''ہائے کم بخت غضب کی حسین ہے، آتی ہے تو دکان میں اجالا سا ہو جاتا ہے''

وہ دل میں تبصرہ کرتا ہوا دوسری گاہک عورت کی طرف متوجہ ہو جاتا، جو رمشا جیسی نہ سہی پر میروز کی توجہ اپنی جانب کر ہی لیتی۔

''آپ کے قد پہ لمبی دھاریاں مناسب نہیں، میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ یہ غونہ اپنے اوپر رکھ کر دیکھ لیں۔''

وہ میز کے نیچے ٹٹول کر کچھ کپڑا نکالتا جس پر پھولوں کی چڑیاں پرنٹ ہوتیں، اور میڈم ہوتیں یامہ پارہ، خوشی خوشی اس کی پرخلوص آفر پر سامنے لگے قدآدم شیشے میں غونہ رکھ کر مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے اس کی اپنے اوپر جمی نظریں نظرانداز کر کے مشورہ مان لیتیں۔ مختلف مشورے ہوتے مگر میروز کا دیا غونہ جس طرح اپنے اوپر جانچا جاتا، فٹ بھر کے فاصلہ سے ہی ارد گرد کھڑے کتنے ہی مرد وزن فیشن شو کی سی جھلک کا لطف اٹھا لیتے۔ کچھ کن اکھیوں سے دیکھتے تو کچھ میروز کی طرح دلیری سے۔

''جب دکھانے والے کو اعتراض نہیں تو ہم کفران نعمت کرنے والے کون۔''

میروز قہقہہ لگاتے اپنی دکان میں موجود مددگار لڑکے سے کہتا

جس کی مسیں ابھی بھیگنی ہی شروع ہوئی تھیں۔ وہ آئینہ کے سامنے کھڑی مصروف خواتین کو دیکھنے کو بجائے اپنی دلچسپیاں رکھتا تھا، اور ادھر ادھر کام کرنے لگتا، صاف لگتا وہ منظر سے غائب ہونا چاہتا ہے۔ ایسے میں میروز کو کسی کام کے لیے اس کی ضرورت پڑ جاتی تو وہ ادھر ادھر ہوتا۔ پھر میروز کی ڈانٹ ہوتی اور اس کی خاموشی۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوتا جب ذرا فرصت کا لمحہ آتا اور دکان خالی ہوتی۔

ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد میروز دکان کی سیڑھی پر آن بیٹھتا۔ سامنے ہی کوئی نیا پلازہ تکمیل کے مراحل میں تھا۔ سال بھر سے اس کی تعمیر کی وجہ سے سڑک خاصی ابتر حالت میں تھی۔ میروز ہر روز گاہکوں سے اس کی دکان تک پہنچنے کے لیے دقتوں پر تبصرے سنتا۔ بلڈر ٹ برا تھا یا بڑا، تبھی ہر روز ہزاروں لوگوں کی شدید ترین پریشانی کے باوجود سریا بجری اس چوڑے روڈ کے آدھے سے زیادہ حصے کو گھیرے تھی۔

اس میں کام کرنے والے کچھ مزدوروں سے میروز کی خاصی شناسائی ہو چکی تھی۔ شرف الدین اس پلازے میں الیکٹرک وائیرنگ کا کام کر رہا تھا اس سے تو میروز کی باقاعدہ دوستی ہو چلی تھی، شاید اس لیے کہ میروز کے باپ کا نام بھی شرف الدین تھا، اور اس نے بھی ایک مزدور کی طرح خون پسینہ بہا کر بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی مہیا کی تھی۔ یہ میروز کی قسمت تھی کہ اس کی بے اولاد خالہ نے اس کے پانچ بہن بھائیوں میں سے اس کو اپنا بیٹا بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سرکاری ادارے میں چپڑاسن ٹائپ ملازمت کرتی تھی، اس ادارے کے نچلے ملازمین کے لیے ایک اسکیم کے تحت سو گز کے زمین کے ٹکڑے گھر بنانے کے لیے الاٹ کیے تھے۔ جس سے خالہ نے میروز کے جوان ہونے پر اچھے داموں بیچ کر اس کی روزی روٹی کے لیے یہ دکان خرید دی تھی۔ دکان شہر کے کسی عمدہ علاقے میں نہ تھی، لیکن خالہ کے نوکری کے دنوں میں بنائے گئے تعلقات نے کام دکھایا۔ اس نے شروع میں گھر گھر جا کر میروز کا بنایا کام دکھایا اور پھر اس کے کام کی جگہ بنائی۔ یوں تقدیر اور تدبیر نے خوب جوڑ بنایا اور میروز کا دھندا رواں دواں ہو گیا۔

شرف الدین واحد ورکر تھا جو کھانے یا اور کسی وقفہ میں نماز بھی پڑھا کرتا تھا۔ میروز کی روز ہی نگاہ اس مخصوص جگہ پر شرف الدین کو عقیدت سے دیکھتی جہاں وہ نماز کے لیے آتا تھا۔ دکان کے اندر سے بھی وہ جگہ صاف نظر آتی تھی۔ نماز کے بعد وہ اپنا کھانا لے کر کبھی کبھار میروز کی سیڑھیوں پر آن بیٹھتا۔ وہ ولی نہ تھا لیکن میروز کو اتنے سخت تعمیراتی کام کے وقفہ کے دوران نماز پڑھنے سے وہ ولی لگنے لگا تھا۔ خود وقت اور احساس ہونے کے باوجود میروز نے جمعہ کے علاوہ شاید ہی کبھی نماز پڑھی ہو۔ جب بھی کبھی شرف الدین آتا تو میروز بے حد اصرار سے اس کو اپنے کھانے میں شامل کرنا چاہتا لیکن وہ ہمیشہ انکار کر دیتا۔ ''میری خاطر بس یہ ہے کہ نماز پڑھ لیا کرو۔'' وہ اتنی محبت سے یہ کہتا کہ میروز شرمندہ ہو جاتا مگر سال بھر کے باوجود جمعہ کے سوا اس نے کبھی وضو نہیں کیا۔

ایک روز شرف الدین صبح گیارہ بجے کے لگ بھگ ایک خوبصورت گول مٹول سے بچے کے ساتھ میروز کی دکان میں داخل ہوا۔ میروز کو دکان کھولے محض پانچ منٹ ہی ہوئے تھے، وہ ابھی دکان کی جھاڑ پونچھ میں ہی مصروف تھا کہ شرف الدین کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بچہ بڑا دل موہ لینے والا تھا۔ میروز نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کون ہے یہ؟ کس پری زاد کا بچہ لے آئے ہو شرف الدین'' میروز نے بچے کو اشتیاق سے دیکھتے ہوئے کہا تو بچہ شرف الدین سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ ''آؤ بیٹھو، چائے وائے پیو، آج منع نہیں کرنا۔ اس گڈے کے ساتھ آئے ہو تو چائے تو پینی پڑے گی، ویسے کون ہے یہ؟'' میروز نے کھوجتے لہجہ میں پھر سوال کیا۔

''میرا بیٹا ہے عماد الدین'' اس کا جواب سن کر میروز حیران ہو گیا۔ یہ خوبصورت سبز آنکھوں والا صحتمند سا گول مٹول تین چار سال کا بچہ اس سیاہی مائل رنگت کے شرف الدین کا کس طور ہوتا، میروز کو سمجھ نہ آ رہا تھا۔

''سگا ہے؟'' اپنے سوال پر میروز اگلے لمحے خود ہی شرمندہ ہو

گیا جب اس نے شرف الدین کو مسکراتے ہوئے پایا۔

''ہاں میرا اپنا ہے، سگا بالکل سگا، اس جیسے تین اور ہیں، تم ان کو دیکھو گے تو بھی یہی کہو گے۔''

''سارے بچے اپنی ماں پر ہونگے؟'' میروز نے اپنے خیال کی تصدیق کے لیے شرف الدین کو دیکھا جس نے بنا کچھ بولے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میروز نے ایک نگاہ بچے پر ڈالی جو اپنی روشن روشن آنکھوں میں ڈھیروں معصومیت لئے اب میروز کو دیکھ رہا تھا۔

''کیا پری سے شادی کی ہے؟'' شرف الدین کے بجائے اسے وہ بچہ کسی سیٹھ کا لگ رہا تھا۔ شرف الدین کے گھر تو اتنا حسین بچہ اسے ششدر کیے دے رہا تھا۔

''آج یہ میرے ساتھ آنے کی بہت ضد کر رہا تھا۔ میں اسے لے تو آیا لیکن اب کہاں رکھوں اس کو جو کام کروں میں۔ تم اپنے ساتھ رکھ لو، میں چکر لگا کر اس کو دیکھتا رہوں گا۔'' شرف الدین نے بچے کا ہاتھ میروز کے ہاتھ میں تھمانا چاہا تو وہ مزید باپ سے چمٹ گیا۔ میروز الجھن میں پڑ گیا کہ کیسے اس بچہ کو باپ سے جدا کر کے اپنے پاس ٹھہرائے، اسے اس قسم کے کاموں کا نہ کچھ تجربہ تھا اور نہ کوئی شوق۔ وہ تو عماد الدین تھا ہی اتنا من موہنا کہ میروز شرف الدین کے اس کام پر راضی ہو گیا تھا۔ اچانک بچے کی نظر دکان کے کسی کونہ میں رکھے کارٹون کی شکل کے غبارے پر پڑی تو وہ باپ سے علیحدہ ہو کر اس کو غور سے دیکھنے لگا۔

''اگر تم ابا کو جانے دو گے تو میں تمہیں یہ دوں گا'' میروز نے لپک کر غبارے کو تھاما جو گزشتہ رات کسی گاہک کے ساتھ آیا ہوا بچہ بھول گیا تھا۔ سرکنڈے کے ساتھ جڑے اس غبارے کو ہلایا تو سیٹی کی سی آواز آ رہی تھی۔ عماد الدین نے غبارہ تھامتے ہوئے باپ کو التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو غبارہ مل گیا ابا، مجھے ساتھ لے جاؤ اپنے، شرف الدین نے ایک نظر محبت بھری اس پر ڈالی اور میروز کو اس کا ہاتھ تھماتا باہر نکل گیا۔

باپ کے جاتے ہی عماد الدین کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو میروز بوکھلا گیا۔ اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر اس نے اسے بہلانے کی کوشش شروع کر دی۔ منہ سے طرح طرح کی آوازیں بچے کو بہلانے کے لیے اس نے نکالیں۔ اس کو گود میں اٹھا کر اپنی دکان سے چار قدم کے فاصلے پر موجود دکان تک لے گیا، یہاں سے بچہ کو کریم والے بسکٹ دلوا کر جب وہ اپنی دکان واپس آیا تو مددگار لڑکا آ گیا تھا۔ اس نے حیرت سے میروز کی گود میں بچہ دیکھا۔

''کون ہے یہ'' بچے کے گال نرمی سے چھوتے ہوئے اس نے پوچھا تو میروز کے منہ سے بے اختیار نکلا ''میرا بیٹا''

لڑکے نے اچنبھے سے میروز پر نگاہ ڈالی تو وہ گڑبڑا گیا۔

''شرف الدین کا بیٹا ہے، آج میرے ساتھ رہے گا۔''

میروز کو نہ جانے کیوں اس سے محبت ہو چلی تھی وہ دل سے اس کو بہلانے اور راضی رکھنے کی کوشش میں تھا۔ لڑکے کا منہ کسی سوال کے لیے پھر کھلا لیکن کسی سوچ کے تحت وہ خاموش ہی رہا۔ میروز کی اس بچے سے لگاوٹ ہر ایک لیے حیران کن تھی اور وہ بچہ بھی میروز کی اتنی محبت محسوس کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے ''ابا'' کی آواز لگا کر منہ بسورا لیکن میروز کے پچکارنے پر جلد ہی بہل گیا۔ شرف الدین کو غالباً میروز کے پاس عماد الدین کو چھوڑ کر اتنا اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے نہیں آیا، میروز کو بھی اس کے نہ آنے کا احساس نہ ہوا، بچے کے ساتھ اس کا کام متاثر ہو رہا تھا لیکن وہ پھر بھی خوش تھا۔ بہن بھائیوں سے جدا ہو کر اکیلے پلنے سے اس کے اندر ایک خلا سا پنپ گیا تھا، جو عماد الدین کے ساتھ اسے کچھ بھرتا ہوا تسکین دے رہا تھا۔

آنے والی گاہک خواتین بھی میروز سے یہ ہی سوال کرتیں کہ یہ خوبصورت سا بے بی کون ہے۔ ایک آدھ تو اس کو چومتے ہوئے کچھ نقدی بھی بطور تحفہ دینے لگیں تو میروز نے قطعاً انکار کر دیا۔ ''ایسا نہیں کریئے میڈم، اس کا باپ میرا استیاناس کر دے گا اگر اسے پتہ چلا۔''

پھر بھی شام تک عورتوں کی بچوں سے لگاوٹ کے تحت عماد الدین کے پاس بہت سی چاکلیٹ، اور سوئٹس جمع ہو گئی تھیں۔

میروز اس کی اتنی قدر دیکھ کر نہال نہال تھا۔ شرف الدین کو اپنی دکان کی جانب آتا دیکھ کر اس نے دل میں کچھ دھندسی محسوس کی لیکن عین اسی وقت ایک دلکش سراپا کی خاتون کے دکان میں داخل ہونے سے اس کی حسیات ادھر منتقل ہوگئیں۔

یہ تو عماد الدین کی سی لگتی ہے! اس نے آنے والی عورت کی ہری ہری سی آنکھوں اور ملائی سی رنگت کو دیکھ کر سوچا اور عماد الدین کی طرف دیکھا۔ اتنے میں شرف الدین بیٹے کا ہاتھ تھامتے ہوئے ہاتھ اور نگاہوں کے اشارے سے میروز کا شکریہ ادا کرتا ہوا بیٹے کو لے کر چلا گیا۔ میروز اس گاہک عورت کے ساتھ مصروف تھا اس لیے دونوں میں کوئی بات چیت نہ ہوسکی۔ نئی آنے والی گاہک خاتون نے آرڈر بھی بڑا دیا تھا۔ ملک سے باہر سوٹ تیار کر کے اس نے بھجوانے تھے، خود بھی وہ دو آتشہ تھی۔ میروز واری صدقہ ہوتے ہوئے اسکی آمد کو اپنی خوش قسمتی قرار دے رہا تھا۔ اس کے کپڑے سنبھالتے سنبھالتے دکان بند ہونے کا وقت ہوگیا تھا۔ میروز گنگناتے ہوئے بہت مسرور تھا۔

اگلے دن شرف الدین اس کا شکریہ ادا کرنے خاص طور سے اس کے پاس آیا تو میروز کے دل میں عماد الدین سے ملاقات کا پھر شوق پیدا ہوگیا۔ اس کی چاکلیٹس تھماتے ہوئے اس نے شرف الدین سے بے حد اصرار کے ساتھ عماد الدین کو پھر لانے کی فرمائش کر ڈالی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اگلے تمام دن بہت مصروفیت کے ہیں۔ کام بہت زیادہ ہے اور کام کرنے والا ایک وہ اور کچھ مدد لڑکا کر دیتا ہے۔

''وہ تو آج بھی میرے ساتھ لگ رہا تھا۔ میں نے ہی اسے شہہ نہ دی۔ میں کام کروں گا یا اس کی دیکھ بھال۔ کل بھی میں ایسا پھنسا آ بھی نہ سکا۔ پر مجھے امید ہے کہ میرے بیٹے نے تمہیں تنگ نہ کیا ہو گا''

اس کی بات سن کر شرف الدین نے اپنے ساڑھے تین سالہ بیٹے پر اتنا یقین ظاہر کیا کہ میروز کو حیرت ہوئی۔ ''ہاں تنگ تو بے شک نہ کیا۔ تبھی کہہ رہا ہوں لے آیا کرو، مجھے اچھا لگا اس کے ساتھ۔''

''تم کب شادی کرو گے میروز؟ عمر گزارنے کے بعد؟'' تیس سالہ میروز کو شرف الدین نے لمحہ بھر کو خاموش کر دیا۔ ''میرے ابا کے پانچ بچے تھے شرفو، صرف ایک میں تھا جس نے کھایا اور کچھ پڑھا بھی، یہ جو میرے ہاتھ میں ہنر آیا یہ بھی میں نے اتنی جلدی اس لیے سیکھا کہ خالہ نے پیسے خرچ کر کے مجھے ایسے شخص کے پاس سال بھر ۔۔ جو یہ کام جانتا تھا۔ ورنہ میری عمر گزر جاتی اس فن میں طاق ہونے تک، جب کوئی راستہ بتانے والا نہ ہو تو وقت بڑا ضائع ہوتا ہے۔ پر میرا بچ گیا اور میں کمانے میں جلد لگ گیا۔ اب میں شادی کروں یا اپنے دو چھوٹے بھائیوں کی فکر کروں جو ابا اماں کے ساتھ ہیں، ابا میں اب اتنی سکت باقی نہیں رہی، وہ دونوں ہیئر کٹنگ سیکھ رہے ہیں اور ساتھ سکول میں پڑھ رہے ہیں۔ میری کوشش ہے کہ ان کو ہنر اور تعلیم دلا کر ان کے پیروں پر کھڑا کر دوں۔ شادی وادی چھوڑو یار!'' میروز نے اچانک قہقہہ لگاتے ہوئے شرف الدین کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''شادی ہو گئی تو اُن پر کیسے خرچ کروں گا اور اپنا گزارہ تو اپنی دکان میں آنے والی حسیناؤں کو دیکھ کر بھی ہو جاتا ہے۔'' میروز نے آنکھ مارتے ہوئے پھر قہقہہ لگایا تو شرف الدین نے ایک لمبی سی ''ہوں'' کی۔

''پھر تم کل عماد الدین کو لاؤ گے نا؟'' میروز نے شرف الدین کے جانے کے لیے اٹھنے پر ایک بار پھر اسے یاد دلایا تو اس نے میروز کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر عماد الدین نہ اگلے دن آیا اور نہ اس سے اگلے دن، پورا ہفتہ گزر گیا۔ میروز بھی آرڈر پورا کرنے میں اتنا جتا تھا کہ اس نے شرف الدین کو یاد بھی نہ دلایا کہ وہ وعدے کے مطابق بچے کو ساتھ کیوں نہیں لایا۔

ہفتہ بھر بعد جب کام کچھ مکمل ہوا تو عماد الدین پھر اسی وقت میروز کے سامنے تھا جیسے پہلے دن آیا تھا۔ اپنی چمکتی آنکھوں کے ساتھ وہ اس کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن آج وہ کچھ کمزور سا لگ رہا تھا۔ ''کیا ہوا شرفو یہ کچھ بیمار و یمار تھا کیا؟'' اس نے عماد الدین کو گود میں اٹھا کر اپنی میز پر بٹھا لیا۔

''ہاں ہفتہ بھر بخار میں تھا، آج ہمت آئی تو پھر میرے ساتھ

جانے کی ضد..... میں بھی لے آیا کہ تم سے وعدہ کیا تھا'' ''اچھا کیا!'' میروز نے شرارت سے عمادالدین کی کان کی لو چھوئی تو وہ ہنسنے لگا ''میروز انکل نہیں کرو'' اس نے اتنی معصومیت سے میروز کو منع کیا کہ میروز نے ایک بار پھر اس کی لو چھولی۔ ایسے ہی ہنستے ہوئے شرف الدین نے بیٹے کو تھپتھپایا اور باہر نکل گیا۔

کام کے اوقات شروع ہو چکے تھے۔ میروز حسب معمول آرڈر میں ملے کام کو مکمل کرنے میں مصروف تھا۔ عمادالدین پر وہ گاہے بگاہے نظر ڈال لیتا جو دکان میں رکھی ڈیزائن کیٹلاگز کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا، تو کبھی داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگتا۔ میروز کا مددگار لڑکا بھی پوری طرح عمادالدین کی نگرانی کے لئے چوکس تھا۔

ظہر ہوگئی تھی۔ میروز نے کام کرتے کرتے دکان سے باہر نظر دوڑائی، کچھ دیر نگاہ رکی رہی۔ وہ آج بھی نماز ادا کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے زیادہ وقت لگا دیا تھا، ورنہ وہ اس وقت تک فارغ ہو کر کھانا شروع کر دیتا تھا، میروز نے شرف الدین کو بدستور نماز اور دعا میں مشغول دیکھ کر سوچا۔

''ابے کیا سارا خود لے لوگے، کچھ ہمارے لئے بھی چھوڑ دو''

اس نے شرف الدین کو غائبانہ پکارا اور عمادالدین کو آواز دینے لگا جو رنگ میں انگلیاں ڈبو کر کاغذ پر لگا رہا تھا۔ عمادالدین نے نظر اٹھا کر میروز کو دیکھا اور رنگ میں ڈوبی انگلیاں شرٹ پر لگانے لگا تو لپک کر میروز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ابے کیا کرتا ہے، ستیاناس کر دے گا اپنے کپڑوں گا'' اس نے قریب رکھے ڈسٹر سے اس کے ہاتھ صاف کرتے ہوئے دیکھا کہ کپڑوں پر جا بجا دھبے وہ پہلے ہی لگا چکا ہے۔ گندہ ہو کر گھر جائے گا تو پھر کون آنے دے گا تم کو میرے پاس، وہ اب سپرے بوتل سے اس کے ہاتھوں پر پانی کی پھوار ڈال کر صاف کرتے ہوئے باتیں کر رہا تھا، عمادالدین خاموش کھڑا تھا۔ جیسے خوب سمجھ رہا ہو۔

شرف الدین پہلے کی طرح آج بھی بیٹے کو دیکھنے نہ آیا، میروز کو بھی اس کے نہ آنے کا شکوہ نہ تھا۔ عمادالدین سے اس کو رمشا صفدر کی نسبت زیادہ اجالا اترتا محسوس ہوتا تھا، جب وہ اپنی زبان میں سے میروز انکل کہتا تو میروز کا جیسے سیروں خون بڑھ جاتا۔ حالانکہ وہ چار عدد بچوں کا ماموں تھا۔ لیکن ان سے اس کی ملاقات اتنی کم ہوتی تھی کہ کوئی تعلق رسمی بات چیت سے زیادہ بڑھ ہی نہ پایا تھا۔ پھر وہ چاروں ایک ساتھ آپس میں اتنے مگن رہتے تھے کہ میروز ماموں جو کبھی کبھار ہی نظر آتے بس قدرت کے بنائے گئے رشتوں کی قطار میں تو موجود تھے لیکن بچوں کے دل میں نہیں، خود میروز نے بھی بڑھ کر ان سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ اب عمادالدین کو وہ ان سب کے حصے کا لاڈ پیار دے رہا تھا کیونکہ اس نے میروز کے دل میں جگہ بنالی تھی۔

ٹھنڈک کے لیے میروز نے بازو اور چہرے پر اسپرے کیا تو عمادالدین بغور اس کو دیکھنے لگا ''نماز کو جانا ہے میروز انکل'' اس نے اپنے پھولے پھولے گلابی گالوں والے چہرے کے ساتھ میروز سے استفسار کیا تو میروز چپ سا رہ گیا۔

''ہاں پہلے کھانا کھالوں پھر جاؤں گا، آؤ چاول کھالو'' میروز نے دل سے ابھرنے والی شرمندگی کی لہر کو دباتے عمادالدین کو کھانے کی طرف متوجہ کیا۔ وہ ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ باہر سڑک سے اچانک شور بلند ہوگیا۔ میروز نے عمادالدین کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر داخلی دروازے سے باہر نگاہ ڈالی تو اندازہ ہوا کہ سامنے والے پلازے سے یہ شور اٹھ رہا ہے۔ کچھ دیر میں اس کی دکان کا مددگار لڑکا فق چہرے کے ساتھ بھاگتا ہوا میروز کے پاس پہنچا اور اس کو کھینچتا ہوا دکان سے باہر ایک طرف لے گیا۔ میروز ''ابے کیا کرتا ہے!'' کہتا رہ گیا لیکن وہ دکان کے ایک طرف کھڑے ہو کر ہوائیاں اڑتے چہرے سے جو کچھ اسے سنا رہا تھا وہ میروز کو لڑکھڑا گیا۔

''کہاں ہے شرف الدین اب؟'' اس کے کپکپاتی آواز میں لڑکے سے پوچھا اور دکان کے اندر نگاہ ڈالی جہاں عمادالدین دروازے پر کھڑا پریشان نظروں سے اسے دیکھتا ننھے قدموں سے باہر آ رہا تھا۔ میروز نے لپک کر اس کے قریب جاتے ہوئے اس کو سینے سے لگایا۔

''میں ہسپتال جاتا ہوں۔تم عمادالدین کا خیال رکھنا۔''

بجلی کی وائرنگ کرتے ہوئے شرف الدین نہ جانے کیسے چھٹی منزل سے نیچے گر گیا تھا۔اس کے ساتھی اور ورک منیجر نے فوری طور پر اس کو ہسپتال کی جانب روانہ کر دیا تھا۔ کچھ لوگ بھی اس کے ساتھ تھے،لیکن یہ خبر سن کر میروز بھلا کیسے رک سکتا تھا۔ وہ اپنے پورے جسم میں رعشہ سا اترتا محسوس کر رہا تھا۔عمادالدین کا چہرہ شرف الدین کے چہرے کے ساتھ مستقل اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔

ہسپتال پہنچتے ہی اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی مذبح خانہ میں کھڑا ہوا ہے،خون آلود جسم کے ساتھ اسٹریچر پر موجود شرف الدین کو فوری طور پر جس ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی اس کو شرع کرنے کے لیے پورے ڈیڑھ لاکھ روپوں کی ضرورت تھی۔ وہ بھی نقد پیشگی ادائیگی کی شرط کے ساتھ۔شرف الدین کا وقفے وقفے سے جھٹکے کھاتا جسم اور میروز کی آنسو بھری التجائیں کچھ اثر نہ دکھا رہی تھیں۔

''آپ کم از کم پچھتر ہزار جمع کرا دیں ہم ان کا علاج شروع کر دیں گے۔''

بقیہ رات تک۔ بے حسی سے کہتا ہوا وہ کوئی انسان نہیں لگ رہا تھا جبکہ دنیا اسے ایک ماہر ڈاکٹر کہتی تھی۔

میروز نے ڈبڈباتی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے فوراً باہر دوڑ لگا دی۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔اپنی موٹر سائیکل کے قریب پہنچ کر وہ رکا اور دیوانہ وار چیخنے لگا۔''کوئی ہے جو میری اس موٹر سائیکل کے بدلے مجھے پچاس ہزار دے سکتا ہو؟'' ارد گرد گزرتے لوگ اس کو دیکھتے اور تبصرے کرتے گزر رہے تھے۔

''ارے کوئی ہے؟ مجھے اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے پچاس ہزار چاہئے،خرید لو یہ مجھ سے،قسم اللہ پاک کی یہ میری اپنی ہے، دیکھو یہ کاغذات!''

وہ جیب سے لائسنس نکالتا مخبوط الحواس دکھائی دے رہا تھا،مگر کسی بھی طرح کی پرواہ کے بغیر وہ چیخ رہا تھا اور لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتے گزر رہے تھے، کچھ کی آنکھوں میں ہمدردی بھی تھی لیکن اتنی نہ تھی کہ وہ رک جاتے،ٹھٹک جاتے،بس انسانوں کا سیل رواں تھا جو اس کو دیکھتا گزرتا رہا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میروز کے چہرے پر خوف بھی چھا چکا تھا۔ وہ آوازیں لگا کر تھک گیا تھا۔اس کے اپنے پاس اتنی نقد رقم ہوتی تو وہ شرف الدین کو مرنے سے بچا سکتا تھا۔لیکن ہر حالت میں اسے فوری پچاس ہزار کا بندوبست کرنا تھا۔پچیس ہزار وہ نہ جانے کس جذبے کے تحت دکان سے ہسپتال کی طرف نکلتے ہوئے جیب میں ڈال لایا تھا۔ یہ وہ رقم تھی جو اس نے اپنی دکان میں کرائے تعمیراتی کام کی مد میں ٹھیکیدار کے حوالے کرنا تھی۔عمادالدین کی معصوم شکل نے جیسے اس کے لیے دکان سے پیسے اٹھانے میں کوئی عار نہیں رکھی۔

شرف الدین کے ساتھ آئے لوگ بھی رقم کا سن کر ادھر ادھر کھسک لیے تھے۔آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میروز کا چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ وہ اچانک سب آوازیں لگانا چھوڑ کر موٹر سائیکل پر سوار ہو کر پلازے کی جانب روانہ ہو گیا تاکہ بلڈر اور ٹیم سے کچھ مدد مانگ سکے، مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ شرف الدین کے جینے سے کسی کو بھی دلچسپی نہیں ہے، یہ چلا جائے گا تو دوسرا کوئی کام کر جائے گا۔ پیسے چلے جائیں گے تو کون واپس کرے گا۔انسان بھول جاتا ہے کہ ایسے میں انسان کسی انسان کو نہیں رب کو قرض دیتا ہے اور وہ رب کسی بھی بھول چوک کے بغیر کئی گنا منافع کے ساتھ اسے واپس لوٹاتا ہے۔

''ارے جاؤ میاں شرف الدین کے گھر والوں کے پاس جاؤ، اتنا پیسہ کہاں تک جمع کرو گے۔''

گلہ تھوکتے ٹھیکیدار نے سو کا نوٹ میروز کو پکڑاتے ہوئے مشورہ دیا۔

''اُس کا گھر شہر کے اس سرے سے کتنا دور ہے یہ تمہیں اندازہ نہیں کیا؟ اتنی دیر میں تو وہ ختم.....'' میروز کے حلق میں 'ختم' جیسے پھنس کر رہ گیا تھا۔

اپنی نئی موٹر سائیکل کا سودا اس نے اپنی دکان کے پڑوسی سے کیا اور علاج شروع کرنے کے لیے پچھتر ہزار جمع کر کے وہ بھاگم بھاگ

ہسپتال پہنچا، اس کو اپنا حلق تڑختا ہوا محسوس ہو رہا تھا، پیروں سے جیسے کسی نے جان نکال دی تھی۔ سامنے سے آنے والے سٹریچر سے وہ ٹکراتے ٹکراتے بچا اور ریسپشن پر پیسے جمع کرانے بڑھا۔

''وہ چلا گیا، اب کوئی فائدہ نہیں''

اس کو بازو سے پکڑ کر کسی نے کھینچ کر رخ موڑا تو ایک آشنا صورت تھی، جو شرف الدین کو لے کر ہسپتال آئی تھی۔ دیوار کے ساتھ اسٹریچر لگا تھا۔ سر سے پیر تک ڈھکا کوئی لیٹا تھا۔ میروز پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس سٹریچر کو تکے جا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں تھاما لفافہ غائب دماغی سے دیکھا۔

''لیکن میں تو اس کے لیے زندگی کی بھیک مانگنے گیا تھا، یہ ایسے کیسے چلا گیا''

بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں بولتا وہ واقعی دیوانہ لگ رہا تھا۔ یہ تو وہ میروز ہی نہ تھا جس کی نگاہ کسی خوش ادا پری پیکر سے پلٹنا بھول جاتی تھی۔ یہاں تو کتنی ہی حسینائیں تھیں۔ جن کے انداز بھی کمال کے تھے لیکن میروز کے لیے شرف الدین کو دبوچنے والی موت نے جیسے دنیا راکھ کے ڈھیر کی سی کر دی تھی۔ وہ نہ اس کا بھائی تھا اور نہ کوئی اور خونی یا قریبی رشتہ، لیکن اسکی موت نے میروز کو جیسے ہر لذت سے دور کر دیا تھا۔ شرف الدین کو قبر میں اتارتے اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گرتے آنسو شرف الدین جیسے انسانوں کو سعید روحیں قرار دے رہے تھے، جو جیئے تو بندگی رب میں اور جب مرے تو بھی رب نے ان کے لیے ایسی جگہ سے مددگار مہیا کر دیا جو کسی کے گمان میں بھی نہ تھا۔

شرف الدین کے سب سے بڑے پندرہ سالہ بیٹے صلاح الدین کو تایا کے ساتھ کھڑا دیکھ کر میروز دھیمے دھیمے قدموں اس کی جانب بڑھا، وہ دونوں قبر کے سرہانے کھڑے تھے۔ ان کے ہلتے لب اور بہتے آنسو ؎ قبر جیسی پہلی گھاٹی کو اس کے پیارے کے لئے آسان ہو جانے کی درخواست کر رہے تھے۔ جنازے کے ساتھ آئے لوگ واپسی کے لیے مڑ چکے تھے۔ میروز نے زندگی میں دو چار مرتبہ قبرستان آنے پر کسی کو بھی اتنی دیر تک دعائیں مانگتا نہیں دیکھا تھا۔ جو وہ بھائی اور بیٹا مانگ رہے تھے۔ قبرستان میں مچی ہل چل کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ بس ایک میروز تھا جو ذرا فاصلے پر کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں، اور آنکھوں سے آنسو شرف الدین کے مرنے کے بعد بھی اس کی اتنی قدر دانی پر رواں تھے۔

''رب کہتا ہے میری طرف آ کر تو دیکھ، دنیا تیری نہ بنا دوں تو کہنا!''

اس کے ذہن میں شرف الدین کی آواز گونجی اور پھر اپنی ہنسی۔ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکلتے ہوئے وہ جان چکا تھا کہ شرف الدین چلتی سانسوں کے ساتھ رب کی طرف گیا تھا تو رب نے اس کی سانسوں میں وہ قوت ڈال دی تھی کہ میروز اس کے لیے صدقہ جاریہ اور اس کے عیال کے لئے مددگار بنا دیا گیا تھا۔ یہ اعجاز وفاداری تھا...... جس نے میروز کے لیے بھی بھلائی کی راہیں کھول دی تھیں!

☆......☆......☆

ام ایمان

گلشن کی خبر رکھنا!

آفس کے بعد ساتھیوں کیساتھ نشست تھی۔ جن معاملات پر مشورے ہونے تھے ان کی فہرست تو اتنی طویل نہیں تھی لیکن چونکہ سب کا نقطہ نظر سننا اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور کرنا تھا لہٰذا وقت کا احساس نہ ہوا۔ سلام دعا کے بعد جب باہر نکلا تو پتہ چلا کہ رات تو اچھی خاصی ہوگئی ہے۔ گاڑی چونکہ میرے پاس تھی تو اپنے چار ساتھیوں کو گھر چھوڑنے کی ذمہ داری بھی میری تھی۔ ان کے گھر میرے گھر کے راستے ہی میں پڑتے تھے۔ لیکن وقت تو بہرحال لگتا ہے لہٰذا جہاں میرے گھر کا راستہ آدھے گھنٹے کا تھا وہاں سب کو چھوڑ کر گھر پہنچا تو مزید ایک گھنٹہ گزر کا تھا۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ نشست میں چائے کے ساتھ بسکٹ تو تھے لیکن ظاہر ہے کہ دو چار بسکٹ سے میرے جیسے شخص کی بھوک مزید بھڑک جاتی ہے۔ کہ دن بھر کے بعد رات کا کھانا بھرپور ہوتا ہے۔ دوپہر میں چند سینڈوچ اور چائے پر گزر ہوتا ہے عموماً ایسی ـَـَـَ ں کے انعقاد پر میں دوپہر کا کھانا ٹھیک سے کھا لیتا تھا لیکن آج تو معاملہ طے شدہ نہ تھا۔ دفتر سے اٹھنے کے وقت ہی فون پر بلاوہ دیا گیا تھا۔ معاملہ ہنگامی نوعیت کا تھا۔ بیوی کے موبائل فون پر دیر سے آنے کا پیغام دے کر میں نشست میں شرکت کیلئے چلا گیا تھا۔

گھر میں داخلے کے ساتھ ہی مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا جو میری بیوی نے صبح ناشتے کی میز پر تاکیداً کہا تھا۔

''شہزاد آپ کو پتہ ہے کہ پچھلے پندرہ دن سے بچے آپ سے ملاقات کو ترس رہے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے؟''

''بھئی کیسے باپ ہیں؟ آپ کو کوئی احساس ہی نہیں۔ رات کو آتے ہیں تو بچے سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور صبح بچوں کے سکول جاتے وقت آپ سو رہے ہوتے ہیں اور پچھلی ہفتہ وار چھٹیوں میں بھی آپ پورے دن کی ـَـَـَ ں میں مصروف رہے تھے۔ آج آپ کے سب سے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ سب کو لے کر کہیں باہر چلیے گا سیر کیلئے۔ اور دیکھیے کوئی وعظ نصیحت نہیں چلے گی۔ وہ ابھی بہت چھوٹا ہے آپ کے درس کو سمجھنے کیلئے...... یوں بھی سالگرہ منانا غلط سہی لیکن بچوں کو لے کر کہیں تفریح کیلئے جانا تو غلط نہیں ہے ناں۔''

شائستہ نے مسکرا کر اپنی بات ختم کی۔

''ہوں''

''ہوں نہیں ہاں کہیے اور کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ سمجھے نا''

شائستہ نے اب کے ذرا سنجیدگی سے کہا۔

سچی بات ہے شائستہ نے ہمیشہ میری مصروفیات اور گھر بچوں کے معاملے میں میری بے توجہی کو ہنس کر برداشت کیا تھا۔ بچوں کے سارے معاملات خود ہی نمٹا لیتی تھی۔ سکول کے مسائل ہوں یا صحت کے...... یہاں تک گھر کے سودے سلف کیلئے چھینیو بھر میں صرف ایک دفعہ مجھے ساتھ چلنے کیلئے کہتی پھر باقی کا پورا مہینہ خود ہی جھیل لیتی۔ گیس اور بجلی کے بل بھی خود ہی دیکھ لیتی کہ مجھے اگر دے دیتی تو ضرور ہی لیٹ سرچارج کی نوبت آ جاتی۔ اپنے میکے جانا ہو یا سسرال اسے پتہ تھا کہ مجھ سے امید رکھنا فضول ہی ہے۔ اب آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں گھر سے بھاگتا ہوں یا میری دلچسپیاں کہیں اور ہیں...... آفس سے تو میں ٹھیک چھٹی کے وقت اٹھ جاتا تھا لیٹ بیٹھنا میری نہ عادت تھی اور نہ ضرورت۔ آفس سے نکل کر میں سیدھا تحریک کے دفتر کا رخ

کرتا وہاں عموماً دو سے تین گھنٹے تو لگ ہی جاتے۔ اگر کوئی ضروری نشست ہوتی تو پھر مزید دو تین گھنٹے لگ سکتے تھے۔لیکن عام حالات میں بھی جب میں گھر پہنچتا تو دس بج رہے ہوتے۔ بچے انتظار کر کے تھک کر سو چکے ہوتے۔ میں خود بھی اتنا تھکا ہوا ہوتا کہ بس کھانا کھا کر بستر کا رخ کرتا۔ میری معصوم بیوی میری ساری مصروفیات سمجھتی تھی لیکن کبھی کبھی اس کا پھر پارہ گرم ہو جاتا۔

''گھر کو بھی آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔''

وہ ناک پھلا کر غصے میں کہتی اور منہ پھیر کر بیٹھ جاتی۔

''جان کیسی باتیں کرتی ہو تمہارے اتنا ساتھ دینے پر ہی تو میں اتنا کچھ کر پاتا ہوں.....نوکری بھی اور پھر تحریک کی مصروفیت بھی۔ میرے ہر کام کے اجر میں تمہارا برابر کا حصہ ہوگا۔انشاءاللہ''

میں نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہتا اور وہ چند لمحے میں میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی۔لیکن بچے تو بچے ہوتے ہیں انہیں نظریات اور انقلاب جیسی موٹی موٹی باتیں کیسے سمجھ آ سکتی تھیں۔انہیں تو توجہ چاہیے .....وقت چاہیے ابو سے پیار بھری باتیں.....ان کی انگلی پکڑ کر باغوں اور جھولوں کی سیر کرنا.....بھلا ان سب باتوں کا کوئی نعم البدل ہے۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے جب میں اپنے گھر میں داخل ہوا تو ایک بار پھر اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا۔واقعی آج تو مجھے وقت پر آنا چاہیے تھا بڑی بھول ہوگئی۔مگر اپنی غلطی محسوس کر کے بھی مجھے غصہ آ رہا تھا۔ بھوک سے معدہ دہائی دے رہا تھا۔ابھی مجرم سمجھ کر بھی میں اپنے آپ کو کوئی سزا دینے یا باتیں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''شائستہ جلدی سے کھانا لگاؤ بھوک سے برا حال ہے۔''لیکن شائستہ تو دروازہ کھول کر غائب تھی۔اپنے کمرے میں تو تھی نہیں میں نے بچوں کے کمرے میں جھانکا وہ بچوں کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔

''شائستہ بس غلطی ہوگئی میں جلدی نہ آ سکا۔پلیز اب اور سزا نہ دو جلدی سے کھانا نکالو.....آ نتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں۔''

شائستہ نے شکایتی ناراض نظروں سے مجھے دیکھا۔''آج آپ کو باہر لے کے جانا تھا۔یاد ہے.....لہٰذا میں نے کھانا نہیں بنایا تھا۔''

''کیا.....یا اللہ یہ کیا کہہ رہی ہو.....اچھا کچھ تو ہوگا.....وہ ہی لا دو.....''

''سادی ڈبل روٹی اور دودھ ہے لے آؤں؟''

''ہاں ہاں لے آؤ بھئی.....جلدی کرو؟''

دودھ ڈبل روٹی سامنے رکھ کر وہ خاموشی سے بچوں کے کمرے میں چلی گئی۔ہوں شائستہ تو واقعی آج بڑی ناراض ہے) خیر منا لوں گا اسے بھی تو میری مجبوری کو سمجھنا چاہیے۔ پیٹ میں کچھ گیا تو ذہن بھی ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ٹرے اٹھا کر میں نے باورچی خانے میں رکھی اور بچوں کے کمرے میں چلا آیا۔آہستہ سے آواز دی۔

''شائستہ.....شائستہ''

''جی کیا بات ہے؟''

''تم لوگوں نے کچھ کھایا یا میں بازار سے لا دوں۔''

''نہیں..... میں نے خاصا انتظار کر کے بچوں کو دودھ دبل روٹی کھلا دی تھی۔''

''اور تم نے خود کیا کھایا؟''

''ابو امی نے کچھ بھی نہیں کھایا۔''

زینب نے پٹ سے آنکھیں کھول کر کہا.....

''اچھا؟''

''ہاں ابو جی.....امی نے کچھ نہیں کھایا.....اور چھوٹو بھی صرف ایک سلائس کھا کر سو گیا تھا.....اسے بہت نیند آ رہی تھی۔''

''نہیں ابو جی میں سویا نہیں۔''

عمر نے بھی آنکھیں کھول کر باپ کو دیکھا۔عثمان بھی اپنے بستر پر چپ چاپ باپ کو دیکھ رہا تھا۔میں نے عثمان کی خاموشی کو بڑا محسوس کیا۔

''کیا ہوا عثمان بیٹا۔اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

میں اسی کے بستر پر بیٹھ گیا۔

''ابو جی..... جواد کہہ رہا تھا کہ تمہارے ابو نقلی ابو ہیں.....جبھی تو وہ تمہیں گھر میں نظر نہیں آتے.....اور نہ تمہیں گھمانے لے کر جاتے

ہیں۔''

''نقلی ابو.....''

''ہاں ابو جی.....کیا آپ ہمارے نقلی ابو ہیں.....''

رشتوں کے معاملے میں بچوں کی نکالی گئی یہ نئی اصطلاح مجھے پریشان کر گئی تھی۔ میں نے حیرانی سے عثمان اور پھر شائستہ کو دیکھا..... اس کے چہرے پر بھی حیرانی کے ساتھ پریشانی بھی تھی۔

''بیٹا یہ نقلی ابو کون ہوتے ہیں؟''

''پوری تفصیل تو مجھے بھی نہیں پتہ لیکن میرا خیال ہے وہ ہوتے ہیں جو کبھی کبھی گھر میں نظر آئیں۔ جن کے پاس بچوں کو ملنے اور ان سے باتیں کرنے کا وقت نہ ہو اور بچوں کو گھمانے لے جانے کا وعدہ کر کے بھول جائیں۔''

عثمان نے اداسی اور حیرت سے گندھی ہلکی سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔

مجھے محسوس ہوا اس کی مسکراہٹ میرے دل میں ترازو ہو گئی ہے۔ چبھن کی شدت سے میں بے چین ہو گیا۔ عثمان کو گلے لگا کر میں نے اس کے گھنگھریالے بالوں پر پیار کیا تو دو موتی سے قطرے میری آنکھوں سے ٹپک کر اس کے بالوں میں گم ہو گئے..... میں نے سوچا میری تحریک اگر میری زندگی ہے تو میرے بچے میرا سرمایہ.....اور ہر رشتے کا حسن اعتدال اور توازن میں پنہاں ہے۔

☆☆☆

فرحت طاہر

نئے صبح وشام پیدا کر

''تو اب یہ ہے آپ کی اوقات سمیرا حامد!'' انہوں نے مانی کا ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔ اپنے سات سمندر پار بیٹے سے بات کر کے ٹھنڈک اندر تک اتر جاتی ہے حالانکہ تشنگی بھی بڑھ جاتی ہے مگر اس کا کیا ہو کہ سمیرا ظالمانہ حد تک حقیقت پسند تھی۔ اسے خیال آیا کہ پیارے بیٹے نے اپنی انتہائی مصروفیات میں سے وقت نکال کر محض رسماً فون نہیں کیا بلکہ اسے ماں کی تنہائی کا احساس ہے!

''سب کی اپنی اپنی دنیا ہے! کوئی کسی کے لیے کیوں خوار ہو؟'' وہ بڑبڑائی ''اب میرا کام تو ختم ہی ہو گیا ہے'' عمر کی نصف صدی گزار کر انسان قنوطی سا ہونے لگتا ہے۔ عمر کی نقدی ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے گویا اب ادھار کا معاملہ ہے مگر سمیرا تو شروع سے ہی اس مزاج کی تھی۔ دنیا کا کبھی بھی مزا نہ لے سکی حالانکہ خوش بختی ہمیشہ سے آنگن میں براجمان رہی مگر دل کی کلی کبھی چٹک نہ سکی۔

بچپن تو جیسے تیسے گزرا کوئی اندازہ نہ کر سکا مگر شعور آتے ہی اسے معاشرتی ناہمواری پریشان رکھتی اور اس کی یہ سوچیں ماں کے لیے بڑی تشویش کا باعث بنتیں۔ ''کیا بنے گا اس لڑکی کا؟'' لیکن چونکہ وہ ایک مکمل Introvert شخصیت تھی لہٰذا اس نے اپنے خیالات پر دبیز پردے ڈال رکھے تھے اور خود کو معاشرہ سے ہم آہنگ کر رکھا تھا۔ تعلیم کے آخری درجے چڑھتے ہوئے اسے راہ عمل متعین کرنے کا کچھ موقع ملا مگر امتحانات سے رزلٹ کے انتظار تک منگنی اور شادی کا مرحلہ اتنا مختصر تھا گویا بس ایک پلک ہی جھپکی ہو! چھ ماہ کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے؟ اس کے منگیتر کی اسلام آباد پوسٹنگ ہوئی تو سسرال والے جلد شادی پر تل گئے۔

شادی زندگی کا ایک نیا باب! شادی جو صرف ایک بندھن نہیں بلکہ وہ تو ذمہ داریوں کا ایک ایسا پیکیج ہے جس میں کوئی الاؤنس نہیں کوئی رعایت نہیں! کوئی بریک ہے نہ کوئی Leave!

پھر تو مصروفیات نے ایسا گھیرا کہ اپنے سارے آدرش بھول گئی۔ قابل اور جان نچھاور کرنے والا شوہر! خوبصورت، صحتمند ذہین بچے، ہر نیا رشتہ تقاضوں کی ایسی ڈوری سے بندھا ہوتا ہے جو انسان کو بہت محبوب ہوتے ہیں۔ خوشحال زندگی ایک ایسا جال ہے جس کے باہر دکھ کے پہاڑ بھی نظر نہیں آتے۔ سو وہ بھی ان میں الجھ کر رہ گئی۔ اس نے اپنی ذمہ داریوں میں کبھی ڈنڈی نہ ماری۔ سب کے حقوق خوش اسلوبی اور عمدگی سے ادا کیے اگرچہ ایک کسک ضرور نہاں خانے میں رہی کہ میرا دائرہ اس گھر سے باہر معاشرہ بھی تو ہے۔ مگر اس کے لیے وقت ہی کہاں تھا؟ ساری گھڑیاں اور کیلنڈر بس گھر کے مطابق ہی چل رہی تھیں۔ بچوں کی پرورش و پیدائش، تعلیم وصحت، ضروریات اور سہولیات زندگی کا محور بنی تھیں اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کے دائرے سمٹتے چلے گئے۔ بزرگ دوسری دنیا کو روانہ ہوئے تو اقربا نئی دنیا کی طرف! امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا، برطانیہ! بچے بھی تعلیم سے فراغت پا کر اپنے اپنے مستقبل کو سنوارنے لگ گئے۔ دونوں بیٹیاں بی اے پاس کرتے ہی شادی کے بندھن میں بندھ کر دبئی اور اسلام آباد چلی گئیں جبکہ بیٹے اے لیول کر کے تعلیم کے حصول کے لیے امریکہ کو پیارے ہو گئے۔ شوہر اپنے کیریئر کی آخری منزل پر تھے لہٰذا اس کے ہر لمحے کو کشید کر رہے تھے۔ پوش علاقے میں گھر تیار ہو چکا تھا اور وہ دونوں اس میں شفٹ ہو چکے تھے۔ کبھی کبھار تو رونقیں گھر کا سکون توڑ دیتیں جب سب بہن بھائی جمع ہوتے ورنہ تو سناٹے کا راج براجمان رہتا تھا۔ تو یہ تھے وہ حالات جن سے سمیرا گزر رہی تھی۔ بقول شاعر ؎

بچے اپنے اپنے گھر کے ہو گئے اور ہم دیوار و در کے ہو گئے

عمر کے اس دور میں کیا کوئی نیا کام شروع ہو سکتا ہے؟ یہ تھا وہ سوال جو وہ دن میں کئی دفعہ اپنے آپ سے کرتی مگر جواب اسے پورے گھر کا چکر لگا کر بھی نہ ملتا۔ اس کی تقریباً تمام دوستیں اور پڑوس میں رہنے والی خواتین ملتے جلتے حالات میں تھیں۔ بہت سی خواتین نے کلب جوائن کئے ہوئے تھے، کئی این جی اوز میں مگن تھیں۔ جبکہ کئی نے انٹرنیٹ اور اسکائپ کے ذریعے اپنے آپ کو مصروف کر لیا تھا۔ مگر یہ ساری سرگرمیاں سمیرا جیسی مشکل طبع کو قطعاً سوٹ نہ کرتی تھیں۔ نرا وقت کا ضیاع ہے! خواہ مخواہ فاصلوں کو ہتھیلی میں لپیٹنا! جو پڑوس میں بیٹھا ہے اس سے تو کوئی گفتگو نہیں اور آسٹریلیا میں رہنے والے اجنبی سے گپ شپ ہو رہی ہے! اور اگر وہ آپ کا عزیز ہے تو بھی اسے اپنے نئے معاشرے میں سانس لینے دیا جائے۔ بلاوجہ دو کشتیوں کا سوار بنا کر ضمیر کا قیدی بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔

اس وقت انہی جذبات کا شکار تھی کہ بڑے بیٹے مانی کا فون آ گیا۔ کیلیفورنیا کے شہری اس وقت سونے کی تیاری کر رہے تھے اور مانی کی جمائیاں بتا رہی تھیں کہ وہ شدید نیند کے عالم میں ماں کی خیریت پوچھ رہا ہے جو اس کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی تھیں ''خواہ مخواہ اپنی نیند خراب کر رہا ہے'' پاکستانی وقت کے مطابق تو اس وقت دن دیہاڑے سخت مصروفیت کا وقت تھا اسی لمحے حامد صاحب وقت سے بہت پہلے گھر میں داخل ہوئے تو سمیرا نے چونک کر خیریت دریافت کی

''ہاں! وہ مجھے کورس کروانا ہے! چھ ماہ کے لیے جانا ہے، وہاں کے عملے کو تربیت دینی ہے'' یوں تو سمیرا یہاں اپنے گھر میں آرام سے رہ سکتی تھی جبکہ ہر پندرہ دن بعد حامد صاحب کو گھر آنا تھا مگر وہ کچھ سوچ کر ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ حامد نے خوشی بھرے استعجاب کے ساتھ اس کا فیصلہ سنا کیونکہ اس سے پہلے وہ درجنوں دفعہ انکار کر چکی تھی۔ اب ان کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اس نتیجے پر پہنچتے کہ پہلے وجوہات کیا تھیں اور اب روانگی کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟ ایک تو ان کی صحت کے حوالے سے وہ تھوڑا پریشان تھی دوسرے یہ کہ مجھے یہاں کیا کرنا ہے سوائے چیزوں کی دیکھ بھال کے! یہ سوچ کر اس نے جانے کی حامی بھر لی۔

چھ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد جب وہ اپنی عارضی رہائش گاہ پہنچے تو سمیرا کے دل میں ایک طمانیت سی پھیل گئی۔ ریسٹ ہاؤس کے باہر دور تک ہرے بھرے کھیت نظر آ رہے تھے۔ ڈھلتی دھوپ میں کھڑے درخت قدرت کا بخشا اپنا فطری کام تندہی سے کرنے میں مصروف تھے۔ اس کے اندر کا لینڈ سکیپ مصور انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگا۔ نہا دھو کر فریش ہوئے تو سہ پہر کی چائے معہ لوازمات موجود تھی۔ باورچی نے رات کے کھانے کے لیے ان کی پسند پوچھی۔ ہدایات لے کر وہ پلٹا تو سمیرا نے کوفت سے اس فراغت کے بارے میں سوچا جو یہاں ہو گی جبکہ کھانا بھی پکا پکایا مل جائے گا۔

شکر ہے کہ کتابیں وغیرہ لے کر آئی ہوں ورنہ وقت گزارنا مشکل ہوتا، اس نے سوچا۔

شام ہوتے ہی جنریٹر کی مدد سے پورا ریسٹ ہاؤس جگمگا اٹھا۔ سمیرا نے نماز مغرب ادا کر کے ٹی وی ریموٹ اٹھایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے ٹی وی آف کر کے استفسار کیا تو پتہ چلا کہ یہاں کے امام مسجد قاسم شاہ نے اپنی گھر والی کو ملنے '' ہے۔ سمیرا نے اس کو اندر بلوا لیا۔ وہ اندر آئی تو اس پر نظر پڑتے ہی ایک خوشگوار سی لہر دوڑ گئی۔ ایک نہایت دلنشین شخصیت تھی۔ اچھا وقت گزرے گا اس کے ساتھ! وہ سلام کر کے جھجکتی ہوئی قالین پر بیٹھنے لگی تو سمیرا نے اسے صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور حیران تھی کہ اس کی نشست و برخاست کسی بھی طرح اس ماحول سے مطابقت نہ رکھ رہی تھی۔ وہ تو ایک پڑھے لکھے اور رکھ رکھاؤ والے طبقے کا پرتو تھی۔

اور پھر اس سے گفتگو کر کے سمیرا کے اندازے درست ثابت ہو گئے۔ زوجہ قاسم پرائیویٹ انٹر پاس کر کے یہاں ایک سکول چلا رہی تھی۔ علم کی لو تو اس میں سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا دن بھر کا شیڈول بتا رہی تھی۔ سات بچے تھے جن میں سے دو بڑی لڑکیاں اس کے ساتھ ہی سکول میں پڑھاتی تھیں جبکہ دو چھوٹے بچے صبح باپ

کے ساتھ رہتے۔ وہ تفصیلات بتاتی رہی اور سمیرا دلچسپی سے محو گفتگو رہی۔ اس دوران سمیرا نے کمرے میں لگی الیکٹرک کیٹل کے ذریعے اس کو چائے بنا کر دی۔ وقت کا پتہ ہی نہ چلا اور عشاء کی اذان ہونے لگی۔ وہ جانے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ باہر سے قاسم نے آواز دی۔

''پنکی پنکی!'' وہ دروازے کی طرف بڑھی تو سمیرا جیسے خواب سے جاگی اور مشینی انداز میں اس کی طرف بڑھی اور جھنجھوڑ کر بولی ''تم پنکی ہو؟''

☆☆☆

''باجی! یہ میری ماسی کی بیٹی ہے۔ یہ بھی آپ سے پڑھنا چاہتی ہے'' رابعہ عرف رابو نے اپنے ساتھ کھڑی شرمیلی سی گلابی رنگت والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سامی باجی نے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں قریبی زیر تعمیر مکان میں رہنے والے چوکیدار کے بچوں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ ابتدا میں پانچ بچے تھے۔ لیکن نہ جانے کہاں کہاں سے بچے آتے گئے اور اب تعداد بیس سے اوپر ہو چکی تھی۔ گھر میں کام کرنے والی برکت بی بی کی پوتی رابعہ اپنی کزن کو لیے آ پہنچی۔ سامی نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''کریمہ! ہم اسے گلابو کہتے ہیں'' رابو جھجکتی ہوئی بولی۔

''درست! تم تو بالکل گلابو ہو پنکی!'' بچوں نے اس نئے لفظ کو دہرایا اور زور زور سے ہنسنے لگے۔ معصومیت اور دلچسپی ان کے ہر زاویے سے عیاں تھی۔ رابو کی آواز میں بھی اعتماد پیدا ہو گیا ورنہ تو بہت ڈرتے ڈرتے یہاں آئی تھی کیونکہ بچوں کی اب تعداد بڑھنے کی وجہ سے ڈسپلن کا مسئلہ پیدا ہونے لگا تھا، جگہ تنگ پڑنے لگی تھی۔ بچوں کی آوازیں بلند ہونے سے پڑوسیوں اور گھر والوں کے ماتھوں پر شکنیں پڑنے لگی تھیں۔ اس وجہ سے سامی نے مزید بچوں کو روک رکھا تھا۔ اب گلابو کے اصرار پر رابو اسے یہاں لے تو آئی تھی مگر خوفزدہ تھی اور اس وقت باجی کا موڈ اچھا ہونے پر سکون کا سانس لیا تھا کچھ ایسے ہی احساسات سامی کے بھی تھے کہ بچوں کے گروپ بنے ہوئے ہیں اب اس کو کہاں ایڈجسٹ کروں گی؟ مگر اس پر نظر پڑتے ہی ایک علیحدہ سے احساس نے سامی کو اس بچی کو خوش آمدید کہنے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ پہلا تاثر درست ثابت ہوا۔

نو دس سالہ کریمہ جسے اب گلابو کے بجائے پنکی ہی کہنے لگے تھے بڑی غیر معمولی بچی تھی۔ ہر کام بہت دلچسپی سے کرتی اور اس کو سکھانے میں سامی کو قطعاً کوئی دقت نہ ہوتی جیسا کہ دیگر بچوں کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اس کے سیکھنے کی رفتار بہت حیرت انگیز تھی۔ لکھائی تو جیسے موتی بکھرے ہوتے اور کام بھی اتنا جامع اور مربوط ہوتا کہ سامی حیران رہ جاتی۔

سب کچھ بہت ہموار طریقے سے چل رہا تھا اور سامی اپنا وقت اور توانائی ایک بہترین کام میں لگا رہی تھی جو کسی کے لیے بھی ضرر کا باعث نہ تھی مگر امی اپنی فطری ممتا کے ہاتھوں مجبور تھیں اور یہ احساس دبے دبے الفاظ میں سامنے آتا۔ ''ابھی تو اتنی پڑھائی سے فارغ ہوئی ہے، تھوڑا سا تو آرام کر لے! اب اتنی محنت کر رہی ہے'' یوں تو ان کے الفاظ میں سامی کی محبت ہوتی مگر ان کے پیچھے وہ تمام خدشات جو بحیثیت ماں ان کو بظاہر ایک غیر منفعت سرگرمی میں نظر آتی۔ یہ سب کچھ تھوڑے عرصے ہی چلا۔

اور پھر وہ دن آ گیا جب سامی کے سسرال والے اسے انگوٹھی پہنانے آ رہے تھے۔ بچے اپنے تعلیمی مستقبل کی فکر سے بے نیاز خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ قطع نظر اس بات سے کہ باجی کی رخصتی کے بعد ان کو کون پڑھائے گا؟ وہ زور شور سے گھر کو چمکانے میں مصروف تھے کہ باجی کی منگنی ہے! مسرت ان کے رگ و پے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ امی بھی بہت متاثر لگ رہی تھیں ان کی کارکردگی سے! سب مسرور تھے! مگر جب بچوں کو اس بات کا فہم ہوا کہ باجی کی شادی کے بعد ان کا تعلیمی کیریئر ختم ہے تو وہ سب اداس ہو گئے! ان کی دعائیں گڈمڈ ہو رہی تھیں! شادی کی خوشی پڑھائی چھوٹنے کے دکھ سے ٹکرا رہی تھی۔ تاریخ بھی فوراً طے کر دی گئی۔ چونکہ منگیتر کی پوسٹنگ اسلام آباد

میں ہوگئی تھی اور جہاں وہ اکیلا ہوم سک نیس کا شکار ہو رہا تھا لہٰذا جلد شادی پر اصرار تھا۔ بہرحال جلد یا بدیر اس سلسلے کو ختم ہی ہونا تھا۔

بالآخر جس دن یہ اعلان ہوا کہ اب اس پڑھائی کا آخری ہفتہ چل رہا ہے بچوں کو ایک چپ سی لگ گئی۔ یہ سکول نما گھر ان سب کے لیے حیات نو تھا۔ اور باجی ان سب کے لیے مشعل راہ! چونکہ اس طبقے کے بچے وقت سے بہت پہلے سمجھ دار ہو جاتے ہیں لہٰذا وہ بات تو سمجھ رہے تھے کہ باجی اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے مگر یہ بات کہ شہر بھی چھوڑ رہی ہیں ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ خصوصاً پنکی تو باقاعدہ سسکیاں لینے لگی۔ نہ جانے وہ تو کیا کیا پروگرام بنا رہی تھی۔ چند دن پہلے ہی اس نے شرماتے ہوئے باجی کو بتایا تھا کہ سواس کے چاچے کا بیٹا تھوڑا سا پڑھا ہوا ہے اور آگے بھی پڑھنا چاہتا ہے۔ سامی اس چھوٹی سی بچی کی دور اندیشی اور معاشرتی فرق کے احساس پر حیرت زدہ رہ گئی کہ وہ اپنے ہونے والے شوہر کو اپنے سے اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتی ہے چنانچہ اس نے کاسو کو اپنے کلاس فیلوز کے پاس بھیج دیا تھا جو تعلیم کے فروغ میں مختلف ذرائع اور طریقے استعمال کر رہے تھے۔ اس پر وہ پنکی بہت مسرور تھی اور اب اس کا ہی تعلیمی مستقبل ختم ہو رہا تھا۔ جن دن اس ہوم سکول کا آخری دن تھا لگتا تھا بچوں کی ہنسی گم ہوگئی ہے۔ خاموشی کی اس فضا نے سامی کو رخصتی سے بہت پہلے ہی اداس کر رکھا تھا۔ اس آخری دن کو یادگار بنانے کے لیے اس نے ایکٹیویٹی کے طور پر منانے کا اعلان کر دیا۔ بچے وقتی طور پر سب بھول بھال کر جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے لگے۔ چھوٹے بچوں اور لڑکوں کے لیے لان اور بیرونی سرگرمیوں کا پراجیکٹ تھا جبکہ لڑکیوں کے لیے کھانا پکانے کی سرگرمی تھی۔ سامی نے پوریاں پکانے کا ارادہ کیا۔ کڑاہی میں تیل کھول رہا تھا اور لڑکیاں ہنسی مذاق کرتے ہوئے بیل رہی تھیں۔ اسی میں یہ انہونی ہوئی کہ پنکی نے جیسے ہی کھولتے ہوئے تیل میں پوری ڈالی ایک دم چیخ پڑی۔ کیونکہ گرم گرم تیل اچھل کر اس کے گردن اور ٹھوڑی پر پڑا۔ ایک دم صورت حال بدل گئی۔ ایمرجنسی میں اس کو فوری طبی امداد کے بعد قریبی کلینک لے گئے۔ شکر ہے کہ بہت زیادہ جلنے سے بچت رہی۔

بچوں کا سکول تو اجڑ ہی چکا تھا۔ اس ناخوشگوار واقعے نے سامی کو بھی کافی دلبرداشتہ کر دیا تھا۔ امی کی جھاڑ الگ پڑی۔ دراصل اس کی ناتجربہ کاری کہ ان احتیاطی ہدایات کا خیال نہ رکھا جو عموماً نوسیکھ لوگوں کو آگ کے معاملے میں دی جاتی ہیں۔ وہ روزانہ پنکی کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر جاتی رہی جو ابھی گھر پر ہی آرام کر رہی تھی جبکہ دیگر بچیوں نے اپنی اپنی ماؤں کے ساتھ کام پر جانا شروع کر دیا تھا۔ تعلیم کا جو خواب ان کی معصوم آنکھوں میں اترا تھا وہ آنکھ کھلتے ہی ایک بھیانک اور سرد حقیقت میں بدل چکا تھا۔ پنکی کے آنسو اس کے لیے تکلیف کا باعث بنتے جو اپنی جلن سے زیادہ تعلیم کا سلسلہ موقوف ہونے پر بہتے۔

اور پھر سامی نئی زندگی کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اب شادی میں دو ہفتے ہی رہ گئے تھے۔ سامی امی ابو کے ساتھ شاپنگ کر کے واپس آ رہی تھی تو اب ان دونوں کو گھر کے قریب ڈراپ کر کے کسی کام سے چلے گئے۔ دونوں ماں بیٹی پیدل گھر کی طرف رواں دواں تھیں کہ دوسری طرف سے پنکی اپنی ماں کے ساتھ کام کر کے واپس آ رہی تھی۔ سلام دعا کے جواب میں پنکی کی ماں سامی کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئی کہ اس نے ان کی بیٹی کو انگلی تھام کر بیچ میں چھوڑ دیا ہے۔ پنکی مستقل اپنی ماں کو روک رہی تھی مگر وہ اپنی بھڑاس نکال رہی تھی۔ امی کو بھی اس پر غصہ آنے لگا۔ ''دیکھا احسان فراموشی؟ کم ظرف تو کم ظرف ہی رہتا ہے۔'' سامی بس ''امی پلیز'' کہہ سکی مگر دل میں سوچ رہی تھی کہ ہم کب ان لوگوں کو اوپر بڑھانے کی فکر کرتے ہیں؟ بس شوقیہ وقت گزاری! نان سیریس رویہ کہ اگر یہ لوگ پڑھ لکھ گئے تو ہمارے کام کون کرے گا؟ وہ اپنی اس سوچ کو بہت طول نہ دے پائی کہ شادی جیسے ٹرننگ پوائنٹ کے سامنے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن کہاں یاد رہ پاتے ہیں؟

آج تیس سال بعد پنکی ایک نئے روپ میں کھڑی تھی! سمیرا نے اس کے چہرے کے گرد سے لپٹا دوپٹہ اضطراری طور پر ہٹایا شاید

جلنے کا نشان دیکھنے کے لیے اور پنکی ہنس پڑی۔ وہ بھی پہچان گئی تھی اور اسے سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ لمحے بھر میں کہاں سے کہاں اڑان ہوگئی تھی۔ چند سکینڈ دونوں کو سنبھلنے میں لگے اور پنکی بول پڑی ''باجی! وہ نشان تو نیچے چلا گیا مگر آپ نے جو پڑھنے کا شوق لگایا تھا وہ تو آگے سے آگے ہی بڑھتا رہا'' وہ مختصر بتا رہی تھی۔ الفاظ کی کیا ضرورت تھی! اس کا حال اور حلیہ سب کچھ کہہ رہا تھا اور پھر اگلے دن کا وعدہ کر کے وہ رخصت ہوگئی اور سمیرا اپنے ماضی کی یادوں میں ایسا کھوئی کہ بچوں کے فون پر بھی ہوں ہاں کرتی رہی حالانکہ وہ سب نئی جگہ پر اپنی ماں کی بوریت کا سوچ کر دھڑا دھڑ فون کر رہے تھے اور ان کو مطمئن پا کر اپنی اپنی سرگرمیوں میں واپس ہو گئے۔ تجسس بھری خوشی کے باعث سمیرا کو نیند نہ آ سکی اور جس کی وجہ نئی جگہ ٹھہری حالانکہ صرف یہ بات نہیں تھی، اصل وجہ تو.....

دوسرے دن پہلی فرصت میں پنکی آ پہنچی۔ بات شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ پنکی اپنے سفر کی داستان سنا رہی تھی۔ اپنے استحقاق یعنی تعلیم کے حصول کی جدوجہد میں وہ تعلیم کی ایسی بلند سیڑھی پر کھڑی تھی جس میں تعلیم باآسانی حاصل کرنے والے، for granted لینے والے کہیں دور اور نیچے کھڑے نظر آتے ہیں۔ کاسو یعنی قاسم نے بھی تعلیم کا سفر جاری رکھا۔ دینی علوم میں تربیت حاصل کر کے یہاں مدرسے اور مکتب کا نظام سنبھال رکھا ہے۔ اگلے دن سے سمیرا کی مصروفیت شروع ہوگئی۔ سکول، مدرسہ اور مکتب جا کر بچوں اور اساتذہ سے ملاقات کرنا اور جائزہ لینا۔

اس پر حیرتوں کے در وا ہوئے کہ جس کام کو وہ بہت سی فرصت، بہت بڑا بجٹ اور بہت بڑی ٹیم سے مشروط کرتی تھی، بلکہ اس پر کیا منحصر یہ تو عام مفروضہ ہی ہے مگر یہاں یہ سب کچھ انتہائی قلیل وسائل کے ساتھ ہو رہا ہے خواہ وہ مادی ہوں یا انسانی! اور سب کچھ بڑے اچھے چمنیور کے ساتھ اور سب سے زیادہ خوش آئند بات یہ تھی کہ یہ دونوں میاں بیوی نہ اپنے معاشرے میں اجنبی بنے اور نہ اپنے ماحول سے بیزار! قناعت اور توکل کی بہترین مثال! بہترین علم کی شاید پہچان یہ ہی ہے کہ جو انسان کو اپنی شناخت دے، اپنے رب اور معاشرے سے جوڑے ورنہ تعلیم کے بعد اپنے آپ کو معاشرے سے بلند کر کے تکبر کی مثال تو بہت عام ہے۔ سمیرا کے لیے ان دونوں میاں بیوی کا عقیدت بھرا تشکر سے لبریز رویہ خاصہ حیران کن تھا! سمیرا خوشی بھرے جذبات سے اپنی نوعمری میں ناتجربہ کاری مگر اچھی نیت سے بوئے گئے بیج کی فصل کو دیکھ رہی تھی اور سرشار تھی! ان تسکین بھری مصروفیات نے اس کو اپنے گھر جانا بھی بھلائے رکھا اور اس پورے عرصے میں وہ صرف دو دفعہ انتہائی ضرورت کے وقت ہی اپنے گھر گئے لیکن تا بکے؟ بہرحال جانا تو تھا اور آخر وہ دن آ گیا۔

حیرت سے حامد صاحب اپنی مسرور سی بیوی کو دیکھ رہے تھے کیونکہ سب کچھ ان کے لیے نیا تھا! سمیرا کہیں جاتی تو باآسانی سیٹ نہ ہوتی اور جب ہو جاتی تو واپسی پر بہت اداس ہوتی مگر اس دفعہ تو سب کچھ اس کے برعکس ہوا اور انہیں اس مد میں قطعاً کوئی دلجوئی اور اشک شوئی نہ کرنی پڑی۔ انہیں کچھ کچھ اندازہ تو ہو رہا تھا مگر درست تخمینہ لگانے سے وہ قاصر تھے کہ ان کی منفرد سی بیوی اپنی کاشت شدہ فصل کی سوغات سے مالا مال ہے جبھی اتنی مسروف ہے۔

اپنے ٹھکانے پر واپس آ کر کچھ دن تو گھر کی صفائی ستھرائی میں لگ گئے۔ حامد صاحب حیران تھے کہ معمول سے کچھ زیادہ اور عادت کے برخلاف سمیرا گھر کی سیٹنگ میں حصہ لے رہی ہے۔ مگر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جب اس کے پلان کو انہوں نے توجہ سے سمجھا۔

ڈرائنگ روم اور لاؤنج کا قیمتی فرنیچر سیل کرنا ہے؟ پھر نیا لیا جائے گا کیا؟ ابھی تو سال بھر بھی نہیں ہوا! انہوں نے اس رقم کا سوچا جو اس کے لیے چاہئے ہوگی۔ ''نہیں اور نہیں لینا! بس اب تو زندگی بہت سمٹ گئی ہے جھنکی ن اب کہاں آتے ہیں؟ جو آتا ہے یہیں لاؤنج میں بیٹھ جاتا ہے فارمل گیسٹ کو آپ ہوٹل یا کلب میں لے جاتے ہیں۔ اور.....''

''بچے جب آئیں گے تو کہاں ٹھہریں گے؟'' حامد صاحب

نے بڑا متعلقہ سوال کیا۔ گویا پانچ سو گز کا مکان چند افراد کی رہائش کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا؟ حالانکہ اس بات ہر ان دونوں کا مشترکہ موقف تھا کہ اتنا بڑا گھر دو آدمیوں کی رہائش کے لیے بہت زیادہ ہے۔

''کیا اوپر کا فلور نا کافی ہے؟ کتنے دنوں کے لیے آتی ہیں ثنا اور ربیعہ؟'' سمیرا نے سوال کر کے ان کو لاجواب کر دیا۔ اپنے ان مسائل سے گویا چھٹکارا حاصل کرنے کا سوچا جو اتنے بڑے گھر کی دیکھ بھال کے لیے ان کو کرنی پڑ رہی ہے۔

''میں مانی اور جنید کی بات.....'' انہوں نے باقاعدہ بحث کی۔

''ابھی تو فی الحال وہ دونوں آ نہیں سکتے اور اگر آئیں گی بھی تو کتنے دن کے لیے؟ آپا کا حماد چار سال بعد آیا چار دن کے لیے! سلطان صاحب کا بیٹا ارسلان ڈھائی سال بعد تین دن کے لیے آیا تھا۔ کتنی رو رہی تھیں مسز سلطان۔'' سمیرا کی باتوں میں چھپے حقائق سے انکار ممکن نہیں تھا کیونکہ ان معاشرتی تبدیلیوں پر وہ دونوں یکسو تھے جو اکثر ان کے زیر گفتگو رہتی تھی۔

''اور اگر ان دونوں نے پڑھائی ختم کر کے واپسی کا فیصلہ کیا تو؟'' اتنی آسانی سے ہار ماننا حامد کو کہاں زیب دیتا تھا؟ سمیرا بات کاٹ کر بول پڑی۔

''تو سو بسم اللہ! اس گھر کی آبادی سے بڑی خوش آئند بات اور کیا ہوگی؟ مگر کیا ایسا ہو سکے گا؟'' اس کے لہجے میں حقیقتوں کو تسلیم کر لینے کا ٹھہراؤ نمایاں تھا۔ حامد صاحب کو اپنی خوش فہمی پر پسینہ آنے لگا۔ پچھلے تیس سالوں میں اس نے اتنی بحث نہ کی تھی۔ اس کو محسوس کرتے ہوئے اس نے لہجہ میں نہایت شیرینی بھرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ''دیکھیں نا! آپ نے اپنی اولاد کے لیے ایک ٹھکانہ بنایا جتنا اور جیسا وہ یہاں قیام کریں ان کی مرضی مگر انہیں اپنے گھر بھی تو بنانے ہیں نا؟ یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ اس ایک گھر سے چار گھر بن جائیں گے؟ یہ تو دستور دنیا ہے!'' سمیرا نے خوشگوار پہلو کی طرف نشان دہی کی اور انہوں نے اپنی بیوی کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔

''ہر عورت ایک معمہ ہے! دنیا جہاں کی عورتیں ساس بننے اور بہو کو بھگتانے کو تیاری کرتی ہیں اور ایک یہ ہے! یا میرے اللہ! اس تخلیق کو سمجھنے کی توفیق دے.....''

بہرحال اس ساری بحث کے بعد طے پا گیا کہ ڈرائنگ روم اور گیراج میں ایک سکول کھلے گا۔ بچے، اساتذہ فرنیچر، کتابیں، اسٹیشنری وغیرہ وغیرہ کی دستیابی پر حامد صاحب کے سوالات کے جواب میں سمیرا ایسا فر فر بول پڑی کہ وہ حیران رہ گئے گویا ہوم ورک بالکل مکمل تھا اور سمیرا تیس سال پہلے لاپروائی سے بوئے گئے بیج کی لہلہاتی فصل سے اتنی motivated تھی کہ اسے آئندہ پلاننگ میں بالکل بھی دقت نہ ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی اگر نمو ہو تو ذرا سی پھوار اتنی بارآور ہو جاتی ہے تو شعور، تجربہ، سنجیدگی اور منصوبہ بندی سے بوئی گئی فصل کیا رنگ دکھا سکتی ہے؟

''اور میرا کیا ہوگا؟ میرے لیے کیا حکم ہے'' حامد نے اس کی بات کاٹی۔ جب وہ اپنے اس پراجیکٹ کے معاونین کے نام گنوا رہی تھی اور اس کا چہرہ امید اور خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہی پھرتی جو تیس سال پہلے تھی ایک بار پھر در آئی تھی۔

''کیوں؟ آپ تو سب کچھ ہوں گے آپ کا گھر، آپ کی توجہ، مدد اور ہمت افزائی'' سمیرا ایک جذب کے عالم میں گھر کے در و دیوار پر نظر ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی گویا بوائی سے پہلے زمین کے نمو بھرے ٹکڑے کو دیکھ رہی ہو جہاں سے زادراہ لینا تھا مستقل ٹھکانے کا!

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر ممتاز عمر

ہمرہی

قطب الدین کی ماں ایک عشرے سے علیل تھیں وہ جسمانی اور نفسیاتی ہر دو قسم کے امراض کا شکار تھیں۔ جوڑوں میں درد، بدہضمی، بلڈ پریشر اور ان سب سے بڑھ کر بڑھتی عمر کی وجہ سے ضعف اور کمزوری نے انہیں لاغر و کمزور بنا دیا تھا، مستقل علاج رہتا۔ جب کبھی صحت کی بہتر حالت میں آتیں تو بھی گھر کے لوگوں کیلئے کوئی نہ کوئی پریشانی سامنے لے آتیں۔ ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہوتیں تو کسی بہانے یا بہو کو کاموں میں مصروف دیکھ کر گھر سے باہر نکل جاتیں اور کئی کئی گھنٹے گزرنے کے بعد بھی گھر نہ لوٹتیں۔ پہلی بار جب یہ واقعہ رونما ہوا تو قطب الدین کی بیوی علینہ جوان کی بھتیجی تھی بہت پریشان ہوئی پڑوس کے گھروں میں پوچھتی پھری، بھوک غائب پریشانی اپنے عروج پر تھی۔ شام کو جب شوہر اور سسر تھکے ہارے گھر میں داخل ہوئے تو یہ خبر سن کر بھونچکے رہ گئے۔ پریشانی کی بات تھی، تھکاوٹ کو نظر انداز کر کے جوتے کپڑے تبدیل کیے بغیر وہ دونوں ہی انہیں ڈھونڈنے نکل پڑے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موبائل فون عام نہ ہوا تھا۔ لینڈ لائن فون خال خال ہوا کرتے تھے ایک قریب رہنے والے رشتے داروں اور دوسرا فاصلے پر مقیم عزیز و اقارب کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں پہنچتے وہ نہ ملتیں البتہ کچھ نہ کچھ سننے کو مل جاتا جسے برداشت کرنے کے سواہ چارہ نہ تھا۔ تین چار گھنٹے کی تگ و دو کے بعد گھر سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر وہ اپنے ماموں زاد بھائی کے گھر بڑے سکون سے بیٹھی ملیں۔

قطب الدین شدید غصے کے باوجود ماں کے احترام و تقدس کے پیش نظر ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ پھر اس نے پوچھا اماں جی اگر آنا تھا تو بتا آتیں۔ جس پر وہ خاموش رہیں البتہ ماموں اور ممانی نے یک زبان کہا آپا نے تو بتایا تھا کہ وہ گھر سے کہہ کر آئی ہیں اور ایک دو روز یہاں قیام کریں گی۔ ہمیں ان کے بیان سے تشویش اس لیے نہ ہوئی کہ ایک تھیلے میں ان کا جوڑا اور دوائیں بھی تھیں۔ ہم بہت خوش تھے کہ بڑے عرصے بعد انہوں نے ہمارے گھر قدم رنجہ فرمایا ہے۔ طویل عرصے سے ایک جگہ پڑے پڑے ان کا دل گھبراتا ہوگا۔

اس پر قطب الدین نے وضاحت کی اماں جی بغیر بتائے آئی ہیں دوپہر سے نکلی ہیں، علینہ محلے پڑوس میں ڈھونڈتی پھری جب میں اور ابا جی گھر آئے تو یہ خبر سنتے ہی تھکاوٹ اور بھوک غائب ہو چکی تھی۔ پھر اس نے پوچھا اماں جی ٹھہریں گی یا چلیں گی۔ وہ ابھی کچھ کہتیں کہ ماموں بولے میاں برخوردار اب تو تسلی ہو چکی ایک دو روز یہاں رہنے دو میں خود گھر چھوڑ آؤں گا۔ جسے سن کر وہ گھر کی طرف پلٹا جہاں ابا جی ناکام و نامراد گھر آ چکے تھے۔ بے چینی کی وجہ سے شدید مضطرب تھے۔ قطب الدین نے گھر میں داخل ہوتے ہی تمام ماجرا کہہ سنایا جس پر علینہ اور ان کے سسر نے سکون کا سانس لیا۔ رات گیارہ بجے ان تینوں نے کھانا کھایا اور تھکن سے چور لمبی تان کر سو رہے۔

قطب الدین کی ماں کا یہ معمول بن گیا کہ جب تکالیف زیادہ ہوتیں اور چلنے پھرنے کی سکت نہ پاتیں تو گھر میں رہتیں اور جیسے ہی کچھ ہمت ہوتی بغیر بتائے گھر سے نکل جاتیں۔ کسی پڑوسی کے گھر جا بیٹھتیں اور دو تین گھنٹے بعد واپس آتیں اور کبھی کسی رشتہ دار کے ہاں چلی جاتیں۔ قطب الدین اور ان کے والد نے تمام ہی رشتہ داروں کو ان کی دماغی کیفیت سے آگاہ کر کے یہ درخواست کی تھی کہ جب بھی

اماں جی ان کے گھر آئیں ان کے پڑوسی کے فون پر مطلع کر دیں تا کہ کسی تشویش سے بچا جا سکے۔

میں عشاء کی نماز پڑھ کر گھر پہنچا تو قطب الدین نے آ کر بتایا کہ کچھ دیر قبل اماں جی کا انتقال ہو گیا ہے۔ طے یہ ہوا ہے کہ صبح آٹھ بجے تدفین کی جائے البتہ عمل اور چھلکے وتکفین ابھی کر لی جائے۔ اس وقت کفن کہاں ملے گا.....؟ میں نے اسے مطلوبہ مقام کا پتہ سمجھا کر پوچھا میرے لائق کوئی کام۔ بولا ابھی تو نہیں تم کتنی دیر میں گھر پہنچو گے۔ بولا کفن لے کر گھر پہنچ جاؤں گا۔ جس پر میں نے کہا ٹھیک ہے میں بھی تمہارے گھر پہنچتا ہوں۔ قطب الدین کے جانے کے ایک گھنٹے بعد میں اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا دس منٹ کی پیدل مسافت پر اس کا گھر تھا۔ حسب روایت گلی میں شامیانہ تنا اور دریاں بچھی تھیں کچھ لوگ سر جھکائے بیٹھتے تھے۔ میں بھی جا بیٹھا اور متجسس نگاہوں سے قطب الدین کو تلاش کرنے لگا۔ مجھے بے چین دیکھ کر برابر میں بیٹھے شخص نے پوچھا کیا بات ہے..... میں نے کہا قطب الدین.....

ابھی میرا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ وہ بولا.....کفن لینے گئے ہیں۔ اب تک آ جانا چاہیے تھا کوئی سوا گھنٹے پہلے میرے پاس سے گیا ہے وہ بولا ہاں مگر اس کے بعد کا تمہیں علم نہیں کیونکہ جیسے ہی وہ کفن لینے گئے ان کی بیوی نے ہماری توجہ ابا جی کی طرف دلائی جو کافی دیر سے نڈھال لیٹے ہوئے تھے۔ بولی اب تو حرکت بھی نہیں کرتے جس پر ہم نے جا کر دیکھا تو انداہ ہوا کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ محلے کے ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا جس نے ان کی موت کی تصدیق کی۔ جس وقت ڈاکٹر گھر سے باہر نکل رہا تھا قطب الدین ماں کا کفن لیے گلی میں داخل ہوا۔ غیر متوقع حالات سے باخبر ہو کر وہ باپ کی چارپائی کے پاس گیا چادر اٹھا کر باپ کا چہرہ دیکھا اور دوبارہ ان کیلئے کفن لینے چلا گیا۔

اگلی صبح آٹھ بجے قریبی مسجد میں دونوں کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اہل محلّہ اور عزیز و اقارب کی بڑی تعداد موجود تھی۔ دونوں ڈولے اٹھائے گئے اور لوگ انہیں قریبی قبرستان کی طرف لے چلے میں ان ہی سوچوں میں غلطاں کہ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جینے اور رہنے کا وعدہ کیا ہو گا مگر کیا وہ روایتی جملہ کہ ہم ساتھ جئیں گے اور ساتھ مریں گے قبولیت پا چکا۔ ہاں دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے اور آج ایک ساتھ جینے مرنے کا عہد.....کرنے والے اپنے وعدہ کو ایفا کر کے اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

امینہ بتول

معرفت

میں اس وقت پچاسی سال کا ایک بوڑھا شخص ہوں۔ میرے بالوں میں ایسی سفیدی آ گئی ہے کہ جب خود کو شیشے میں دیکھتا ہوں تو ہنسنے کے ساتھ میری آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں۔ میرے بال کپاس کے پھول جیسے ہیں۔ یہ وہی بال ہیں جن پہ میں جوانی میں خاصا نازاں تھا۔ تب یہ سیاہ ریشم جیسے تھے ملائم اور چمکدار اور میں بالوں کی ایک مست جھالر بڑے شوق سے ماتھے پہ بکھرایا کرتا تھا۔ ہیئر سٹائل بدل بدل کر لوگوں سے داد وصولتا۔

اور اب انہی بالوں کی کوئی چمک ہے، نہ گھنیرا پن! وہ بانکپن بھی تو نہیں رہا نا! اور میں تم سب سے یہی کہتا ہوں کہ جوانی انسان کی زندگی میں بہار کے موسم جیسی ہے۔ تازہ، کھلی ہوئی، رنگین، نازک اور خوشبودار! جب بہتے پانی کی شفاف لہروں میں اپنا عکس ڈھونڈ کر دیکھنا بڑا اچھا لگتا ہے۔ کائنات کا ہر رنگ اپنا اپنا سا ہوتا ہے۔ پوری دنیا اپنی ملکیت لگتی ہے چاہے جیب میں کچھ بھی نہ ہو۔ ہم اپنے دل کے بے تاج بادشاہ ہوتے ہیں۔ اوپر سے من میں ''محبت'' کا تڑکا لگ جائے تو سواد دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ ہے جوانی! بے فکری، بے گانگی، بے پروائی کا دوسرا نام۔ مجھے بھی کچھ یوں محسوس ہوتا تھا۔

میں کہتا تھا شاید دھنک کے سات رنگوں کو ملا کر میری تخلیق ہوئی ہے۔ سرخ رنگ ویسے ہی بہت پسند تھا۔ طبیعت کی چونچالی، شوخی، شرارتیں سب کچھ اپنے عروج پہ تھیں۔ حسن کا میں شروع سے دیوانہ رہا ہوں۔ چہروں کا ہو یا قدرتی نظاروں کا.....!

ذرا ٹھہرو، جوانی کی گنگناتی ندی پہ کشتی کے سوار و، رکو.....ابھی ایک رخ اور باقی ہے جو شاید تمہیں پسند نہ آئے بلکہ تم مجھے کوسو گے لیکن مجھے یہ رخ دکھا لینے دو، ہو سکتا ہے تمہیں کچھ فائدہ ہی ہو۔

یوں سمجھ لو کہ میں تمہیں کینوس کی ایک تصویر دکھا رہا ہوں جس کی دو اطراف ہیں۔ سامنے والی طرف سبزہ، رنگ، پہاڑ، تتلیوں پھولوں کا ایک حسین منظر پینٹ کیا ہوا ہے اور یہی تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ جوانی ہے۔ جس دور سے تم گزر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ شاید قدرت کا سارا حسن تمہارے ہی لیے بنا ہے، پھولوں سے خوشبو کی لپٹیں تمہارے واسطے اٹھتی ہیں کہ ''آیئے جناب، مہکئے''، گلابوں کا کھلا چہرہ تمہارے محبوب کا روپ اختیار کرتا جاتا ہے کہ چلو ''دل کے بہلانے کو غالب، یہ خیال اچھا ہے۔''

یہاں تک کہ تم چاند میں بھی خود کو رقص کرتے ہوئے تصور کرتے ہو! وہ بچپن میں نانی دادی سے سنا تو ہو گا نا کہ چاند کی بڑھیا چرخا کات رہی ہے۔ میں نے بھی سنا تھا! اور تم چھوٹے بچے تھے تو کیسے جھٹ یقین کر لیتے تھے! میں بھی کر لیا کرتا تھا۔ دیکھو! ایمانداری سے بتاؤ جونہی تمہارے من میں جوانی کی کونپلیں پھوٹنے لگیں تو نانی کی انہی باتوں پہ ہنسا کرتے ہو! بچپن کی معصومیت کہہ کر لطف لیتے ہو۔ واہ صاحب چاند کی بڑھیا، چرخا؟ ٹیکنالوجی نے تو چاند تک پہنچا دیا مگر بڑھیا کہیں نہیں ملی! یہی نا؟

تم ذرا گوگل کی ویب سائٹ پر ''چاند کی بڑھیا'' سرچ کرو تو کتنی مضحکہ خیز بات لگے گی۔ لیکن میں بھی بڑا گھاگ ہوں۔ دیکھو یار مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔ اب کبھی کبھی چاندنی راتوں میں تم یہ ضرور سوچتے ہو نانی جسے بڑھیا کہتی تھی وہ تو کوئی حسین پری ہے جو ایک دن تمہارے آنگن میں اترے گی۔ ہے نا؟ چلو بھئی شرماؤ مت، تم یہ بات اپنے دل سے بھی چھپاتے ہو مگر دیکھ لو میں جان گیا۔ آپس کی بات ہے دوست، میں بھی ایسا ہی سوچتا تھا!

سائنس ٹچ سکرین تک پہنچا کر بھی کچھ روایتی جذبے کبھی نہیں چھین سکتی۔ میں جانتا ہوں تم بھی شاید اپنے آئی فون یا لیپ ٹاپ سے شغل کرتے ہوئے مجھ بوڑھے کی دوٹوک باتیں بیزاری سے سن رہے ہو گے مگر میاں جس سائبان سے تم اب گزر رہے ہو میں وہاں سے برسوں پہلے کا سفر طے کر آیا ہوں۔ آگے کچھ گُر کی باتیں ہیں۔ سن لو!

ہاں تو اس کینوس کی سینری پہ غور کرو جسے میں نے جوانی سے تشبیہ دی ہے۔ لو تصویر پلٹ گئی......!

یہ کیا؟ حیران ہو رہے ہو نا! ہاں صاحبو، یہ ہے دوسری طرف جہاں سوکھے ٹنڈ منڈ سے درخت اور برفباری کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے پتہ ہے کہ تمہیں پھیکے رنگوں سے بنا یہ منظر نہایت بھدا معلوم ہو رہا ہے۔ مگر یہ زندگی کی حقیقت ہے۔ جوانی کا منہ زور اور سرکش گھوڑا بھگانے سے پہلے اسے توجہ اور غور سے دیکھ لو۔ اس رخ میں پھیلا ہوا سُونا پن اور خاموشی کا اچھی طرح مشاہدہ کرو۔

اس عمر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جوانی بہار ہے تو بڑھاپا سردی، ٹھٹھرتا، لرزتا، کپکپاتا ہوا۔

جب برفیلی شاموں میں انسان گرم کپڑوں میں بند کمروں تک محدود ہو جاتا ہے۔ زیادہ دل کرے تو مونگ پھلی، چلغوزوں، بادام پستہ کا مزہ لے لیا۔ اسی طرح بڑھاپے میں وہ کافی حد تک اپنے خول میں قید ہو جاتا ہے۔ تب اپنی عینک تک نظر نہیں آتی تو رنگوں کی طرف بھلا کیا تکے......!

اور ضعیفی کے اس دور میں پرانی یادیں سردی کے خشک میووں کا مزہ دیتی ہیں۔ ظاہر ہے دانت اتنے مضبوط تو ہوتے نہیں کہ کچھ چبا سکیں تو میرے جوان، ہم لوگ یادوں سے یہی چلغوزوں کا حظ اٹھا لیا کرتے ہیں۔ کم از کم میں تو ایسا کرتا ہوں اور یہ جو برفباری کا منظر دیکھ رہے ہو، اس میں برف کا گرتا ہو ہر نرم گالا مجھے اپنی زندگی کے لمحوں جیسا لگتا ہے۔ زیست کے پل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جیون کی کھیتی میں برف کی طرح گرتے رہتے ہیں۔ اور جب ختم ہو جائیں تو زندگی کی مہلت ختم!

میں نے بہار کا مزہ چکھا، خوشی و سرور کا ہر لمحہ سمیٹا، پھر سردی آئی اور آہستہ آہستہ عمر کی گزرتی گھڑیوں نے ٹھپ کر دیا۔ پھر وقت کی برفباری نے میرے بال بھی سفید کر دیئے۔ جوانی کہیں دم توڑ گئی۔ بےوفائی کر گئی، بڑھاپے کا ''پُروقار'' سا طوق میرے گلے میں پہنا کر ......گویا میں ''سنو مین'' بن گیا۔ برف کا جیتا جاگتا آدمی کیونکہ اس عمر میں جذبے ٹھپ ہو جاتے ہیں۔ میرے جیون کی برفباری تب تک ہی رہے گی جب تک میں زندہ ہوں اور ظاہر ہے میں اور بوڑھا ہوتا جاؤں گا مگر یاد رکھنا برفباری کا یہ موسم تم پر آئے گا۔

جوانی ساری عمر ساتھ نہیں رہتی۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ برفباری ہمیشہ یاسیت میں ڈوبی ہو۔ یہ سکون کی پیامبر بھی ہوتی ہے کیونکہ بڑھاپا بہرحال ستانے کو زندگی کا آخری سٹیشن ہوتا ہے۔ یہی ہے تصویر کا دوسرا رخ جو تمہیں دکھانا چاہتا تھا۔ مگر ابھی بات مکمل نہیں ہوئی۔ میں گُر کی بات بتاؤں گا تو اسے اپنے جوان جسم میں توانائی کی طرح بھر کر رکھ لینا۔ یہی بات شاید تمہارے بڑھاپے میں توانائی بن کر کام آئے! پہلے میں اپنی ذاتی زندگی کی کچھ پرتیں کھول لوں پھر ہم اصل بات کی طرف آئیں گے۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا منتوں مرادوں کا بیٹا تھا، منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا اور سونے کا چمچ آج تک نہیں چھوڑا۔ نہیں سمجھے؟

تو برخوردار میں نے پوری زندگی میں ہمیشہ دولت کی فراوانی دیکھی ہے۔ پہلے ماں باپ نے کوئی کمی نہیں کی پھر عملی زندگی میں آ کر کمانے لگا تو میں نے خود یہ کمی نہیں ہونے دی۔ بہترین کھایا پیا، اوڑھا پہنا۔ حسب منشا جیا، صاحب جائیداد شروع سے تھا، کچھ میری صلاحیتیں بھی تھیں کہ والد کے کاروبار کو معمولی تعلیم کے باوجود خوب پھیلایا۔ جیب بھاری تھی اور حلقۂ احباب وسیع۔ سو جوانی کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ بڑی سہانی رُت تھی۔ اپنی مرضی سے شادی کی اور تین بیٹے ہوئے۔ ابھی پچھلے سال ہی میری خاموش طبع زوجہ محترمہ ہاجرہ بیگم بڑی خاموشی سے روٹھ کر اگلے جہان سدھار گئیں۔ چلو کوئی نہیں،

جلد میں بھی اسے جالوں گا اور مناؤں گا۔

ہاجرہ میری اچھی ہمسفر تھی۔ مجھ سے دو برس چھوٹی اور ہماری ہم آہنگی کمال کی تھی۔ لیکن یہ اعتراف کرتا ہوں کہ وہ کبھی میرے شوق اور ذاتی معاملات میں مخل نہیں ہوئی۔ اسے میری من موجی طبیعت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ پھر بچے ہوئے تو میں نے ساری ذمہ داری اسے سونپ دی۔ کوئی دخل نہیں دیا ہاں ان کی فرمائش اور ضروریات رد نہیں کیں۔ ہر شے مہیا کی۔ اصولی طور پر بچوں کی شخصی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے تھا مگر مصروفیت کے شکنجے نے جکڑا ہوا تھا۔ میں اپنے بیٹوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکا تو آج میرا بھی حق نہیں کہ ان کے قیمتی وقت میں سے اپنے لیے چند لمحوں کا مطالبہ کروں۔

دو بڑے بیٹے امریکہ ہوتے ہیں اور چھوٹے والا انگلینڈ۔ تینوں کی الگ لائف ہے اور وہ اپنے آپ میں مگن خوش وخرم رہ رہے ہیں۔ میں اپنی دو کنال کی وسیع کوٹھی میں ملازمین کی فوج کے ساتھ رہتا ہوں۔ آہ تنہائی۔ ہاں تو بتا رہا تھا، کاروبار کی وجہ سے اکثر مجھے ملکوں کا سفر کرنا پڑتا اور یہیں سے سیاحت کا شوق ہوا۔ دیس دیس گھوما، شہر شہر پھرا، نگر نگر دیکھا۔ کچھ سال لندن میں گزارے۔ پھر واپس آ گیا۔ ماہ و سال بیتتے گئے، بچے بڑے ہو گئے۔

میں نے جو چاہا پایا، لیکن اب راز کی بات کہے دیتا ہوں۔ سب کچھ پا کر بھی خالی ہوں۔ ایک چیز جو میں حاصل نہ کر سکا وہ ہے ''معرفت''۔ اپنی ذات کی معرفت! لوگ مجھے ایک کامیاب اور امیر بوڑھے کے طور پر جانتے ہیں مگر میں جانتا ہوں کہ اندر سے کھوکھلا ہوں۔ میں نے زندگی سے صرف لیا، اس کا حق ادا نہیں کیا اور زندگی کا پہلا حق یہی ہے کہ تم غور کرو دینے والے نے تمہیں زندگی کیوں دی؟ کس مقصد کے لیے بنایا؟ غور وفکر معرفت کا پہلا مرحلہ ہے۔ تم یہ پہیلی بوجھ لو تو آگے کے بہت سے مراحل طے ہو جائیں گے۔ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تو ایک ملک ایک خطہ یا سرزمین وجود میں آئی اور اس کا نام امر ہو گیا۔ ایڈیسن نے بلب ایجاد کیا، دنیا کو روشنی کا شعور آیا۔ گراہم بیل نے ٹیلی فون سے رابطوں کو آسان کیا، فاصلے سمٹتے گئے، سات سمندر پار رہنے والوں کے لیے ساگر کے چوڑے پاٹ کم ہو گئے۔ تو سنوان جیسے بہت سے لوگوں نے صرف اپنا مقصد پہچانا اور تاریخ کے ماتھے پہ لافانی کارنامے سجا دیئے۔

آئن سٹائن نے فزکس کے چند اصولوں پر ریاضی کے حساب کتاب سے توانائی اور مادے کا تعلق متعارف کروایا۔ شاعروں، ادیبوں کے قلم نے جذبوں کو امر کیا، مصوروں نے رنگوں سے نادر فن پارے تخلیق کئے۔ جس طرح نیوٹن نے کشش ثقل کا تخیل پیش کیا، اسی طرح یاد رکھو ایک کشش ثقل تمہارے اندر بھی ہے جو تمہیں روح کے مدار کے مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔ بس وہ مرکز تمہاری ''معرفت'' ہے۔

میں اپنے مدار پہ گھومتا رہا مگر مرکز تک رسائی حاصل نہیں کی۔ خالق کو صرف زبان سے مانا، اسے پہچانا نہیں۔ میں پچاسی سال کا ہو کر بھی خود شناسا نہیں۔ ان طویل سالوں میں اگر ایک بھی لمحہ معرفت کا ہوتا تو مجھے اس متاع حیات پر فخر ہوتا۔ کوئی اہم انسان دنیا سے چلا جائے تو لوگ یہ نہیں کہتے وہ فلاں عمر میں گیا۔ صرف یہ یاد رکھا جاتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کو کتنا کارآمد بنایا۔ بس یہی گُر کی بات ہے۔ یہی حاصل کلام ہے۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید کا اصل۔

میرے دوست میں تمہیں جوانی کے گلاب چننے سے منع نہیں کرتا، ضرور چنو، زندگی کے لمحے صرف گزارو نہیں، انہیں جینا سیکھو مگر اپنی معرفت حاصل کرنا مت بھولو۔ اپنا آپ پہچانو، ''خود شناسائی'' رب تک رسائی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اسے گرہ سے باندھ لو۔ برینڈڈ کپڑے جوتے پہن کر چند سال سر اٹھا کے جینا زندگی نہیں۔ جھکی کمر ایک دن تمہارے اٹھے سر کا فخر چھین لے گی۔

بس کہتے کہتے شام پڑ جائے گی سو یہ بھی بہت ہے۔ لو میرے مگ میں کافی بھی ٹھنڈی ہو گئی، مگر اچھا ہوا کچھ باتیں کر لیں۔ تم خود کو ''سنو مین'' نہ بننے دیا۔ اور دیکھنا سالوں بعد جب تمہارے جیون کی برفباری ہو گی تو تم ایک مختلف مقام پہ ہو گے کیونکہ معرفت تمہارا حاصل ہو گی۔ کاش میں بھی اسے پا لیتا.....!!

☆.....☆.....☆

خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ

فاطمہ نام، حضور اکرم کی چوتھی اور سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ والدہ حضرت خدیجہ الکبریٰ تھیں ام محمد کنیت تھی۔ تمام مکارم اخلاق وفضائل آپ پر ختم ہو گئے تھے۔

لقب: سیدہ عورات عالم اور سردار النساء اہل جنت ہیں۔ آپ کے القاب زہرہ طاہرہ، مطہرہ، زاکیہ، راضیہ، مرضیہ اور بتول ہیں۔

القاب کی وجہ تسمیہ:

شیخ ابن حجر، فاطمہ، بتول اور زہرا کی وجہ تسمیہ لکھتے ہیں کہ آپ کا نام فاطمہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوست رکھنے والوں کو دوزخ کی آگ سے بچنے ظر رکھا ہے۔

بتول اس وجہ سے ہے کہ آپ اپنے زمانہ کی عورتوں سے فضل و دین اور حسب میں ممتاز تھیں۔

زہرا اس وجہ سے ہوا کہ آپ میں زہرت، جمال و کمال بہت زیادہ تھا۔ بتول اس عورت کو کہتے ہیں جو دنیا سے علیحدہ ہو اور اللہ کے قریب ہو۔ حضرت مریم علیہا السلام والدہ عیسیٰ کا لقب بھی بتول تھا۔ (منتہی الارب)

بچپن سے ہی ان کی طبیعت میں بے حد سادگی متانت اور سنجیدگی تھی۔ آپ کی بہنیں کھیل کود میں مشغول رہتیں لیکن آپ کا دل ایسے کاموں میں نہیں لگتا تھا۔ آپ کہیں آنا جانا پسند نہ فرماتی تھیں ہمیشہ اپنی والدہ کے پاس بیٹھی رہتیں آپ کی یہ سادگی رسول اللہ ﷺ کو بے حد پسند تھی۔ اسی وجہ سے آپؓ بتول کے لقب سے یاد فرمائی جاتی تھیں۔

چونکہ آپ صورت وسیرت میں آنحضرت سے بہت مشابہ تھیں اس لحاظ سے آپ کا لقب ذاکیہ اور راضیہ قرار پایا۔

ولادت: سیدہ فاطمہ الزہراؓ کے زمانہ ولادت کے بارے میں مختلف روایات ہیں ایک روایت کے مطابق ان کی ولادت بعثت نبوی سے پانچ سال قبل ہوئی۔ جبکہ حضور کی عمر مبارک پینتیس برس تھی۔ دوسری روایت کے مطابق بعثت سے ایک سال قبل اور تیسری روایت میں ہے وہ سنہ 1 بعثت میں پیدا ہوئیں یہ روایت مستند کہی جاتی ہے۔ آپ حضرت عائشہ سے پانچ سال بڑی تھیں۔

بچپن: آپ کی پیدائش کے ایک سال بعد اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کو منصب رسالت پر فائز کر دیا۔ جب آپؓ نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ آپ کے بابا جان اور دوسرے اہل ایمان ظالم کافروں کے نرغے میں گھرے ہوئے دن رات بے اندازہ مصائب اور مظالم برداشت کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی طبیعت میں سنجیدگی نے جگہ لے لی تھی۔ آپ بچپن سے ہی متین اور تنہائی پسند تھیں۔ نہ کبھی کھیل کود میں حصہ لیا نہ ہی گھر سے باہر قدم نکالا۔ اور رسول اللہؐ سے ایسے ایسے سوالات پوچھتیں جن سے ان کی ذہانت و متانت کا ثبوت ملتا۔ دنیا کی نمود ونمائش سے سخت نفرت تھی ایک دفعہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے کسی عزیز کی شادی تھی، انہوں نے فاطمہؓ کیلئے عمدہ کپڑے اور زیورات بنوائے جب گھر سے چلنے کا وقت آیا تو سیدہ نے یہ قیمتی کپڑے اور زیور پہننے سے انکار کر دیا اور سادہ حالت میں ہی شادی میں شرکت کی۔

حضرت خدیجہؓ سیدہ فاطمہ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتی

تھیں۔ایک دفعہ جب وہ ان کو تعلیم دے رہی تھیں تو ننھی بچی نے پوچھا اماں جان اللہ کی قدرتیں تو ہم ہر وقت دیکھتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ خود نظر نہیں آ سکتے؟

حضرت خدیجہؓ نے فرمایا میری بچی اگر ہم دنیا میں اچھے کام کریں گے اور خدا کے احکام پر عمل کریں گے تو قیامت کے دن اللہ کی خوشنودی کے مستحق ہوں گے۔اور یہی اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔

سنہ 10 بعثت میں حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی تو سیدہ فاطمہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔حضور نے سیدہ کی تربیت اور نگہداشت کے خیال سے حضرت سودہ سے نکاح کر لیا۔آپ کی پوری زندگی دین حق کے پھیلاؤ میں صرف ہو رہی تھی۔اتنی مصروفیت کے باوجود آپ حضرت فاطمہ کے پاس بیٹھتے ان کی دل جوئی کرتے اور قیمتی تحائف سے نوازتے۔

تنہائی کے اوقات میں حضرت حفصہ بن عمر فاروق، حضرت عائشہ بنت ابوبکر، حضرت اسماء بنت ابوبکر، فاطمہ بنت زبیر وغیرہ۔ سیدہ کے پاس وقتاً فوقتاً آ بیٹھتیں اور ان کی غم گساری کرتیں۔تبلیغ حق کے جرم میں مشرکین رسول مقبول کو بہت تکلیفیں پہنچاتے کبھی سر اقدس پر خاک ڈال دیتے۔کبھی راستے میں کانٹے بچھا دیتے۔جب حضور گھر تشریف لاتے تو حضرت فاطمہ انہیں تسلی دیا کرتیں، اپنے والد محترم کی تکلیفوں پر اکثر اشکبار ہو جاتیں، اس وقت حضور انہیں تسلی دیتے اور فرماتے۔

میری بچی گھبراؤ نہیں خدا تمہارے باپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا۔

ایک مرتبہ حضور خانہ کعبہ میں نماز ادا کر رہے تھے کفار کو شرارت سوجھی انہوں نے اونٹ کی اوجھڑی لا کر سجدہ کی حالت میں حضور کی گردن مبارک پر ڈال دی۔اس شریر گروہ کا سرغنہ ابوجہل اور عقبہ بن ابی مغیط تھا۔کسی نے حضرت فاطمہؓ کو بتایا کہ تمہارے باپ کے ساتھ شریروں نے کیا حرکت کی ہے۔آپ یہ خبر سنتے ہی بے چین ہو گئیں۔ دوڑتی ہوئی کعبہ پہنچیں اور حضور کی گردن مبارک سے اوجھڑی ہٹائی کفار ارد گرد کھڑے ہنستے رہے اور تالیاں بجاتے رہے۔

حضور کو اس وقت ایسی تکلیف و اذیت پہنچی کہ بے اختیار پیمانہ صبر چھلک پڑا اور آپ کی زبان اقدس سے یہ کلمات نکل گئے۔یا اللہ تو ان مشرکوں کو سخت عذاب میں مبتلا کر اور ابوجہل اور ابولہب کو برباد کر۔ (بخاری و مسلم)

خدا کی قدرت چند سال بعد یہ سب لوگ جنگ بدر میں ذلت کے ساتھ مارے گئے۔

ابولہب جنگ بدر کے تھوڑا عرصہ بعد ہی مکہ میں انتہائی دردناک موت مرا۔

شعب ابی طالب میں بھی پورے تین برس تک حضرت فاطمہؓ پورے خاندان کے ساتھ بے اندازہ مصائب و الام برداشت کرتی رہیں۔

ہجرت: مکہ میں کافروں کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا اور حضور کے قتل تک کے منصوبے تیار کیے جانے لگے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی۔کچھ عرصہ کے بعد حضور نے اپنے اہل بیت کو بھی مدینہ بلوا لیا۔آپ نے اپنے غلام ابورافع اور حضرت زید بن حارثہ کو مکہ ۔۔ ان دونوں حضرات کے ہمراہ حضرت فاطمہؓ، حضرت ام کلثومؓ، حضرت سودہؓ، حضرت ام ایمنؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔مدینہ پہنچ کر حضرت سودہؓ اور بنات رسول نبیؐ کے پاس اپنے نئے گھر میں قیام پذیر ہو گئیں۔

نکاح: جب حضور کی لخت جگر فاطمہ نکاح کی عمر کو پہنچیں تو آپ نے ان کا نکاح اپنے چچازاد بھائی حضرت علیؓ سے کر دیا۔حضرت علیؓ اپنی شادی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے مجھے مشورہ دیا کہ تم فاطمہ کے ساتھ اپنے نکاح کیلئے حضور کی خدمت میں درخواست پیش کرو۔میں نے درخواست پیش کی۔آپ نے فرمایا تمہارے پاس شادی کیلئے کچھ سامان بھی ہے میں نے عرض کیا نہیں۔پھر آپ نے فرمایا وہ زرہ کیا ہوئی جو جنگ بدر میں ہاتھ آئی تھی۔میں نے کہا وہ تو ہے فرمایا بس وہ کافی ہے۔حضرت علی نے اس زرہ کو حضرت عثمانؓ کے ہاتھ ساڑھے چار سو درہم میں

فروخت کر کے شادی کا انتظام کیا۔ بعد میں حضرت عثمان نے وہ زرہ رسول اللہؐ کی خدمت میں نذر کر دی۔ حضور نے خوش ہو کر آپ کو دعائیں دیں۔(اصابہ)

زرہ کی قیمت فروخت حضرت علی نے آپ کی خدمت میں حاضر کی تو آپ نے فرمایا دو تہائی خوشبو پر صرف کرو اور ایک تہائی سامان شادی اور دیگر اشیائے خانہ داری پر خرچ کرو۔

پھر آپ نے حضرت انس کو حکم دیا کہ جاؤ ابوبکر، عمر، اور عبدالرحمٰن بن عوف اور دیگر مہاجرین وانصار کو بلا لاؤ جب سب دربار رسالت میں جمع ہو گئے تو نبیؐ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

اے گروہ مہاجرین وانصار

ابھی جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس یہ اطلاع لے کر تشریف لائے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المعمور میں فاطمہ بنت محمد کا نکاح اپنے بندہ خاص علی ابن ابی طالب سے کر دیا ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ عقد نکاح کی تجدید کر کے گواہان کے روبرو ایجاب وقبول کرواؤں۔

پھر نبیؐ نے خطبہ نکاح پڑھا اور علی مرتضیٰؓ سے متبسم ہو کر فرمایا میں نے چار سو مثقال چاندی مہر پر فاطمہ کو تیرے نکاح میں دیا کیا تجھے رہے؟

حضرت علی نے عرض کیا بسر وچشم۔

پھر آپ نے دعا فرمائی۔ اللہ تم دونوں کی پراگندگی جمع کرے اور تمہاری سعی مشکور ہو۔ تم دنوں پر برکت نازل کرے اور تم سے پاک اولاد پیدا ہو۔

(نوٹ: پراگندگی جمع کرے کے معنی ہیں...... اللہ تمہاری مختلف طبیعتوں کو ایک دوسرے کا معاون بنادے)

پھر سب نے دعائے خیر وبرکت مانگی اور نبی پاک نے ایک طبق چھوہارے حاضرین میں بانٹ دیئے۔ آپ دونوں کا نکاح ایک روایت کے مطابق ۲ ہجری میں ہوا دوسری روایت کے مطابق ۳ ہجری شوال میں ہوا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت فاطمہ کی عمر نکاح کے وقت اٹھارہ برس تھی دوسری روایت کے مطابق پندرہ برس تھی اور حضرت علی کی عمر تقریباً اکیس سال تھی۔

رخصتی: حضرت علیؓ نے سرور کائنات کے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ سیدۃ النساء رخصت ہو کر اس گھر کی ملکہ بنیں۔ رخصتی سے پہلے نبیؐ نے حضرت فاطمہ کو بلایا اپنے سینہ مبارک پر ان کا سر رکھا اور پیشانی پر بوسہ دیا پھر اپنی لخت جگر کا ہاتھ حضرت علی کے ہاتھ میں دے کر فرمایا۔ اے علی کی بیٹی تجھے مبارک ہو۔

اس کے بعد حضرت فاطمہ سے فرمایا: اے فاطمہ تیرا شوہر بہت اچھا ہے۔

پھر آپ نے دونوں میاں بیوی کو حقوق وفرائض بتائے اور خود دروازے تک وداع کرنے آئے۔ دروازے پر علی مرتضیٰ کے دونوں بازو پکڑ کر انہیں دعائے خیر وبرکت دی۔ حضرت علی اور سیدۃ النساء دونوں اونٹ پر سوار ہوئے، حضرت سلمان فارسی نے اس کی نکیل پکڑی۔ حضرت اسماء بنت عمیس بعض روایتوں کے مطابق سلمیٰ ام رافع یا ام ایمن ان کے ہمراہ گئیں۔

جہیز: سرور کائنات نے اپنی بیٹی کو جو سامان شادی کے موقع پر دیا اس کی تفصیل یہ ہے۔

ایک بستر مصری کپڑے کا جس میں اون بھری ہوئی تھی...... ایک نقشی تخت یا پلنگ، ایک چمڑے کا تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، ایک مشکیزہ، مٹی کے دو برتن یا گھڑے پانی کیلئے، ایک چکی، ایک پیالہ، ایک جائے نماز، دو چادریں، دو بازو بند نقرئی۔

جب حضرت فاطمہؓ اپنے نئے گھر چلی گئیں تو نبی کریمؐ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اجازت مانگی۔ پھر اندر داخل ہوئے ایک برتن میں پانی منگوایا۔ اپنے دست مبارک اس میں ڈالے اور حضرت علیؓ کے سینہ اور بازوؤں پر پانی چھڑکا۔ پھر حضرت فاطمہؓ کو اپنے پاس بلایا وہ شرم وحیا سے جھجکتی ہوئی آپ کے سامنے آئیں...... آپ نے ان پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا۔

اے فاطمہؓ میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان میں بہترین

شخص سے کی ہے۔

ولیمہ: شادی کے بعد نبیؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ دعوت ولیمہ بھی ہونی چاہیے مہر ادا کرنے کے بعد جو رقم بچ گئی تھی حضرت علیؓ نے اسی سے ولیمہ کا انتظام کیا۔ دسترخوان پر پنیر، کھجور، نان، جو، اور گوشت تھا۔ حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ یہ اس زمانے کا بہترین ولیمہ تھا۔

حضرت فاطمہؓ کا گھر: حضرت فاطمہ کا گھر سلجھنے نبوی سے کسی قدر فاصلے پر تھا۔ آنے جانے میں تکلیف ہوتی تھی۔ ایک روز رسول کریم نے حضرت فاطمہ سے فرمایا بیٹی مجھے اکثر تمہیں دیکھنے کیلئے کافی دور آنا پڑتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے قریب بلالوں۔

حضرت فاطمہ نے عرض کیا آپ کے قرب وجوار میں حارثہ بن نعمان کے بہت سے مکانات ہیں آپ ان سے فرمائیے وہ کوئی نہ کوئی مکان خالی کرادیں گے۔

جب حارثہ بن نعمان کو یہ خبر پہنچی کی رسول اپنے قریب اپنی بیٹی کا گھر اپنے قریب چاہتے ہیں تو وہ فورا رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے گھر سے متصل گھر آپ کی بیٹی کیلئے خالی کر دیا۔

گھریلو زندگی: حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی ساری زندگی عیش و آرام سے بیگانہ اور زینت وآرائش سے بے نیاز رہی۔ اکثر اوقات غربت وتنگدستی میں بسر ہوتے تھے۔ گھر گرہستی کے کاموں میں محنت و مشقت کرنے کا یہ حال تھا کہ چکی پیتے پیتے ہاتھوں میں چھالے اور گٹے پڑ گئے تھے۔ جھاڑو دینے، کھانا پکانے، اور دوسرے کامون میں مصروف رہنے کے باعث کپڑے میلے ہو جاتے۔ پانی لاتے لاتے مشکیزہ کی رگڑ سے سینہ مبارک اور کمر پر نیلے داغ پڑ گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فتوحات اسلام روز بروز وسعت پذیر ہو رہی تھیں۔ مدینہ منورہ میں مال غنیمت آنا شروع ہو گیا تھا ایک دن حضرت علی کو معلوم ہوا کہ مال غنیمت میں کچھ لونڈیاں آئی ہیں۔ سیدہ فاطمہؓ سے کہا کہ فاطمہؓ چکی پیتے پیتے تمہارے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے ہیں اور چولہا پھونکتے پھونکتے تمہارے چہرے کا رنگ نکھتیں ہو گیا ہے تم جاؤ اور آنحضرت ﷺ سے ایک لونڈی مانگ لو۔ آپ دونوں میاں بیوی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوئے اور ایک لونڈی کیلئے درخواست پیش کی ان کی درخواست سن کر حضور نے فرمایا۔

میں تم کو کوئی قیدی خدمت کیلئے نہیں دے سکتا۔ ابھی اصحاب صفہ کے خوردونوش کا تسلی بخش انتظام مجھے کرنا ہے میں ان لوگوں کو کیسے بھول جاؤں جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر اللہ اور اللہ کے رسول کی خاطر فقر وفاقہ اختیار کیا ہے۔

دونوں میاں بیوی خاموشی سے گھر تشریف لے گئے۔ رات کو نبی ان کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا کہ تم جس چیز کے خواہش مند تھے اس سے بہتر ایک چیز میں تم کو بتاتا ہوں ہر نماز کے بعد دس دس بار سبحان اللہ، الحمد اللہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ اور رات کو سوتے وقت سبحان اللہ، الحمد اللہ ۳۳، ۳۳ بار اور اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھ لیا کرو۔ یہ عمل تمہارے لیے بہترین خادم ثابت ہوگا۔

ایک بار رسول اللہ حضرت فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے گئے دیکھا کہ سیدۃ النساء اونٹ کی کھال کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور اس میں بھی تیرہ پیوند لگے ہوئے ہیں آٹا گوندرہی ہیں اور زبان پر کلام اللہ کا ورد جاری ہے۔ آپ یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا فاطمہ! دنیا کی تکلیف کا صبر سے خاتمہ کر اور آخرت کی دائمی مسرت کا انتظار کر اللہ نیک اجر دے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں حضرت علیؓ کو بلانے ان کے گھر گیا تو دیکھا سیدہ فاطمہؓ حضرت حسینؓ کو گود میں لیے چکی پیس رہی ہیں۔

ایک دفعہ نبیؐ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے دیکھا کہ دروازے پر ایک رنگین پردہ لٹکا ہوا ہے اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ نے اپنے ہاتھوں میں چاندی کے کنگن پہن رکھے ہیں۔ آپؐ یہ دیکھ کر واپس لوٹ گئے حضرت فاطمہ بہت دلگیر ہوئیں اور رونے لگیں۔ اتنے میں نبیؐ کے غلام ابورافع پہنچ گئے رونے کا سبب پوچھا آپ نے ماجرا

سنایا تو بولے آپ نے کنگن اور پردے کو ناپسند فرمایا ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے دونوں چیزوں کو فورا آپ کی خدمت میں بھیج دیا اور کہلا ۰ ۰ ، میں نے انہیں اللہ کی راہ میں دے دیا۔ آپ بہت خوش ہوئے اپنی بچی کے حق میں دعائے خیر و برکت مانگی اوران اشیاء کو بیچ کر تمام اصحاب صفہ کے اخراجات پر صرف کردی۔

ایک بار حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں نبی کریمؐ کی دعوت تھی دسترخوان پر کھانا چنا گیا تھا جس میں بھنا ہوا گوشت، روٹیاں اور کباب تھے۔ حضور نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت اور کباب رکھ کر ایک شخص کو دیا کہ یہ لے کر میری جگر گوشہ فاطمہ کو دے آؤ وہ بھی میری طرح کئی دنوں سے بھوکی ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضور فاطمہؓ کے مکان پر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ انہوں نے اتنی چھوٹی چادر اوڑھ رکھی ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر کھلا رہ جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ساری رات ایک باغ سینچا اور اجرت میں تھوڑے سے جو حاصل کیے۔ حضرت فاطمہ نے ان کا ایک حصہ پیسا اور کھانا تیار کیا۔ عین کھانے کے وقت ایک مسکین نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا میں بھوکا ہوں۔ سیدہ نے وہ سارا کھانا اسے دیا پھر باقی اناج کا کچھ حصہ لے کر پیسا اور کھانا پکایا۔ ابھی کھانا پک کر تیار ہی ہوا تھا کہ ایک یتیم نے دروازے پر آ کر صدا لگائی آپ نے وہ کھانا بھی اسے دے دیا پھر باقی اناج پیسا اور تیسری بار کھانا تیار کیا۔ عین کھانے کے وقت ایک مشرک قیدی نے اللہ کی راہ میں کھانا مانگا تو آپ نے سارا کھانا اسے دے دیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا پسند آئی کہ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اور وہ اللہ کی راہ میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ (الدھر)

عابدہ وزاہدہ فاطمہ الزہراؓ

حضرت فاطمہؓ کمال درجے کی عابدہ تھیں۔ حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ میں نے اپنی ماں کو شام سے صبح تک عبادت کرتے اور اللہ کے حضور گریہ وزاری کرتے دیکھا لیکن اپنی دعاؤں میں انہوں نے کبھی اپنے لیے کوئی دعا نہیں مانگی۔

ایک مرتبہ نبی کریمﷺ نے سیدہ سے پوچھا بہترین عورت کے کیا اوصاف ہیں؟

انہوں نے عرض کیا ابا جان عورت کو چاہیے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرے اولاد پر شفقت کرے اپنی نگاہ نیچی رکھے، اپنی زینت کو چھپائے، نہ خود غیر کو دیکھے نہ غیر اس کو دیکھ پائے۔ آپ یہ جواب سن کر بے حد خوش ہوئے۔

میاں بیوی کے تعلقات: میاں بیوی میں غصہ تکرار ہو جانا کوئی نئی بات نہیں۔ کبھی کبھار حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ میں غصہ اور تکرار کی نوبت آ جاتی مگر وہ جلد صلح صفائی کر لیتے اور دل میں بغض و کینہ نہ رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے درمیان رنجش ہو گئی آپ اداس اور غمگین ہو کر بابا جان کی خدمت میں شکایت لے کر گئیں حضرت علیؓ بھی پیچھے ہو گئے حضورؐ نے آپ کی بات سن کر فرمایا۔ جان پدر تم ہی بتاؤ وہ کون سا شوہر ہے جو اپنی بیوی کے پیچھے اس طرح خاموش چلا آتا ہے۔

حضورؐ کا اتنا فرمانا تھا کہ میاں بیوی دونوں کے دل کا غبار دھل گیا۔ اور وہ اپنی اپنی غلطیوں پر نادم ہو گئے۔

اسی طرح ایک بار پھر دونوں میں ناراضگی ہو گئی حضور کو جب معلوم ہوا تو آپ کا چہرہ فکر و تردد سے تمتمتیں ہو گیا فورا جا کر دونوں میں مصالحت کرا دی۔ واپس ہوئے تو بہت مسرور و شادمان تھے۔ کسی نے پوچھا اے اللہ کے رسول آپ بہت خوش نظر آ رہے ہیں فرمایا ہاں ان دو شخصوں میں جو مجھے بہت زیادہ عزیز ہیں کچھ رنجش پڑ گئی تھی ان میں صلح کروا کے آ رہا ہوں۔ (اصابہ)

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے غورا بنت ابی جہل سے نکاح کا ارادہ کیا۔ سیدہ فاطمہ سخت آزردہ ہوئیں جب رسول کریمؐ ان کے پاس تشریف لائے تو سیدہ نے عرض کیا یارسول اللہ وہ مجھ پر سوت لانا

چاہتے ہیں۔ نبی کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ ادھر غورا کے سرپرست بھی نبیؐ سے اس نکاح کی اجازت لینے آئے۔

نبی کریمؐ نے مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا۔

آل ہشام علی سے اپنی لڑکی کا عقد بیان کرنے کیلئے مجھ سے اجازت چاہتے ہیں لیکن میں اجازت نہ دوں گا۔ البتہ علیؓ میری لڑکی کو طلاق دے کر دوسری لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں۔ فاطمہؓ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جس نے اس کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ جس نے اس کو دکھ پہنچایا اس نے مجھے دکھ پہنچایا۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرنا چاہتا لیکن اللہ کی قسم اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے نکاح کا ارادہ فوراً ترک کر دیا اور حضرت فاطمہ کی زندگی تک دوسرے نکاح کا خیال تک دل میں نہ لائے۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ سے فرمایا کہ تم لوگوں کی جس شخص سے لڑائی ہے اس سے میری بھی لڑائی ہے اور جس سے تمہاری صلح ہے اس میری بھی صلح ہے۔ یعنی جن لوگوں سے تم نارضامند ہوگے اس سے میں بھی نارضامند ہوں گا جس سے تم خوش ہوگے اس میں بھی خوش ہوگا۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ہم دونوں سے کس کو زیادہ محبوب رکھتے ہیں آپ نے فرمایا تم سے زیادہ فاطمہؓ محبوب ہے اور فاطمہ سے زیادہ تم عزیز ہو۔

آنحضرت کی سرگوشی اور حادثہ جاں گداز۔

وصال نبوی سے کچھ دن پہلے حضرت فاطمہؓ آپ کی خبر گیری کیلئے حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں تشریف لائیں نبیؐ نے نہایت شفقت سے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور ان کے کان میں آہستہ سے کوئی بات کہی جسے سن کر وہ رونے لگیں۔ پھر آپ نے کوئی اور بات کہی جسے سن کر وہ ہنسنے لگیں۔ جب چلنے لگیں تو عائشہ صدیقہؓ نے ان سے پوچھا۔ اے فاطمہ تیرے رونے اور ہنسنے میں کیا بھید تھا۔ سیدہ نے فرمایا: جو بات نبیؐ نے اخفا میں رکھی ہے میں اسے ظاہر نہ کروں گی۔

رسول کی رحلت کے بعد ایک دن حضرت عائشہ صدیقہؓ اور بعض روایات کے مطابق حضرت ام سلمہؓ نے اس دن کے واقعہ کی تفصیل پوچھی حضرت فاطمہ الزہراء نے فرمایا پہلی دفعہ آپ نے فرمایا تھا کہ پہلے جبرائیل امین سال میں ہمیشہ ایک بار قرآن کھیں کا دورہ کیا کرتے تھے اس سال خلاف معمول دو بار کیا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ میری وفات کا وقت قریب آ گیا ہے اس پر میں رونے لگی۔

پھر آپ نے فرمایا تھا کہ تم اہل بیت میں سے سب سے پہلے مجھے ملوگی اور تم جنت کی عورتوں کی سردار ہوگی۔ اس بات سے مجھے خوشی ہوئی اور میں ہنسنے لگی۔

رحلت سے قبل جب آپ پر بار بار غشی طاری ہو جاتی تو حضرت فاطمہؓ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا فرمایا۔ ہائے میرے باپ کی بے چینی۔

نبیؐ نے فرمایا تمہارا باپ آج کے بعد کبھی بے چین نہ ہوگا۔ سرور کائنات کے وصال سے حضرت فاطمہؓ پر غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ انہوں نے بے اختیار ہو کر فرمایا

پیارے باپ نے دعوت حق کو قبول کیا اور فردوس بریں میں داخل ہوئے۔ آہ! جبرائیل کو ان کے انتقال کی خبر کون پہنچا سکتا ہے۔

پھر دعا مانگی بارالہا: روح فاطمہؓ کو روح محمد ﷺ کے پاس کر دے۔ الٰہی بروز محشر شفاعت محمد ﷺ سے محروم نہ فرما۔

نبیؐ کے وصال کے بعد کسی نے حضرت فاطمہ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

نبیؐ کے وصال کے بعد آپ کی میراث کا مسئلہ پیش ہوا۔ فدک ایک موضع تھا جو نبی نے بعض لوگوں کو اس شرط پر دے رکھا تھا کہ جو پیداوار ہو نصف وہ رکھیں گے اور نصف آپ کو بھیج دیا کریں گے آپ اپنے حصے میں سے کچھ اپنے اہل وعیال کے خرچ کیلئے رکھ لیتے باقی مسافروں اور مساکین پر خرچ کر دیتے۔ حضرت فاطمہؓ کو کچھ لوگوں نے بتایا کہ فدک نبی کریم کی ذاتی ملک تھا اور آپ اس کی وارث ہیں چنانچہ انہوں نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر کے پاس فدک کی وراثت کا

دعویٰ کیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اے فاطمہؓ میں رسول کے اعزہ کو اپنے اعزہ سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ انبیائے کرام جو متروکہ چھوڑتے ہیں وہ کل کا کل صدقہ ہوتا ہے اور اس میں وراثت جاری نہیں ہوتی۔اس لیے میں اس جائیداد کو تقسیم نہیں کرسکتا۔البتہ نبی کی زندگی میں اہل بیت اس سے جو فائدہ حاصل کرتے تھے وہ اب بھی کرسکتے ہیں۔

حضرت فاطمہؓ کو اس جواب سے بہت رنج پہنچا اور وہ حضرت ابوبکرؓ سے ناراض ہوگئیں اور اپنی وفات تک ان سے نہ بولیں۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ بیمار ہوئیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ عیادت کیلئے تشریف لائے سیدہ نے انہیں اپنے مکان کے اندر آنے کی اجازت دے دی اور اپنی رنجش دور کردی۔

وفات: حضورؐ فرما چکے تھے کہ فاطمہ مجھ سے سب سے پہلے آملیں گی اور ان یہ بات حرف بحرف سچ ثابت ہوئی۔ نبیؐ کی رحلت کے چھ ماہ بعد ہی 3 رمضان المبارک ۱۱ ہجری کو 29 سال کی عمر میں عالم فانی کو چھوڑ کر راہی ملک بقاء ہوئیں۔

وفات سے پہلے اسماء بنت قیس کو بلا کر فرمایا۔ میرا جنازہ لے جاتے ہوئے اور تدفین کے وقت پردہ کا پورا پورا لحاظ رکھنا۔ اور سوائے میرے شوہر کے اور کسی سے میرے غسل میں مدد نہ لینا۔تدفین کے وقت زیادہ ہجوم نہ ہونے دینا۔حضرت علی نے خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور کفن پہنا کر جنازہ باہر لائے جنازہ پر آپؓ کی وصیت کے مطابق چاروں طرف لکڑی باندھ کر پردہ کھینچ دیا گیا جو آج تک امت مسلمہ میں رائج ہے۔

آپ کی نماز جنازہ حضرت ابوبکرؓ نے پڑھائی۔حضرت ابن عباس فضل ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ نے میت کو قبر میں تارا۔آپ کی وصیت کے مطابق جنازہ رات کو نکلا اس لیے زیادہ صحابہ کرامؓ شرکت نہ کرسکے۔

اولاد: حضرت فاطمہؓ کے تین صاحبزادے تھے جن کے نام حسنؓ، حسینؓ اور پتنگے تھے۔صاحبزادیاں بھی تین تھیں رقیہؓ، ام کلثوم اور زینبؓ، پتنگے اور قیہ کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔حضرت ام کلثومؓ کا عقد حضرت علیؓ نے ۱۷ ہجری میں حضرت عمر فاروقؓ سے چالیس ہزار درہم مہر پر کیا۔حضرت ام کلثومؓ سے ایک صاحبزادے حضرت زیدؓ اور ایک صاحبزادی رقیہؓ پیدا ہوئیں۔

حضرت فاطمہؓ کی تیسری صاحبزادی حضرت زینبؓ کا عقد عبداللہ ابن جعفر طیارؓ سے ہوا جن سے دو صاحبزادے عبداللہ اور حضرت اون پیدا ہوئے۔

یہ حضرت فاطمہ کی امتیازی خصوصیت ہے کہ آپ کے علاوہ حضور کی کسی صاحبزادی سے نسل نبوت نہیں چلی۔

اللہ تعالیٰ اپنی ان نیک بندی پر ہزاروں رحمتوں کی بارش کرے۔ آمین۔

حضرت فاطمہ کے بارے میں حضور کے ارشادات ہیں فاطمہ جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔

اے فاطمہ تم تمہارا خاوند اور تمہاری اولاد میرے ساتھ جنت میں سب ایک جگہ ہوں گے۔

فاطمہ میرا پارہ گوشت ہے جس نے اس کو غصہ دلایا اور ناراض کیا اس نے مجھے غصہ دلایا اور ناراض کیا۔

حضرت فاطمہ سے کتب احادیث میں اٹھارہ حدیثیں مروی ہی۔

ان کے رواۃ میں حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسین، حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ جیسی جلیل القدر ہستیاں شامل ہیں۔

علامہ اقبال نے حضرت فاطمہ کے بارے میں کہا ہے۔

مزرع تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اسوۂ کامل بتول

حضرت سیدہ بتول کی شان یہ ہے کہ وہ تسلیم رضا کی کھیتی کا حاصل اور ماؤں کیلئے تقلید کا مکمل اور بہترین نمونہ ہیں۔

(اس مضمون کی تیاری کیلئے تذکارہ صحابیات طالب ہاشمی تاجدار مدینہ کی شہزادیاں اور صحابیات از علامہ نیاز فتح پوری سے مدد لی گئی ہے۔)

جنت البقیع کے برآمدے میں

سات آٹھ دن ہو گئے تھے مسجد نبوی میں نمازیں ادا کرتے ہوئے کہ وہی سانحہ پیش آ گیا جو حوا کی بیٹیوں کے ساتھ ازل سے مقدر میں لکھا ہوا ہے.....افسوس سا ہوا کہ مدینہ میں ابھی دو دن قیام باقی تھا لیکن خیر.....صبح تہجد کے وقت مسجد نبوی میں جانے کی روٹین برقرار رکھی۔فرق اتنا تھا کہ ریاض الجنتہ میں جو یکسوئی نصیب نہیں ہو رہتی تھی تنہائی کی طلب برقرار تھی وہ ختم ہوگئی۔سبز گنبد بالکل میرے سامنے ہوتا میں مردانہ حصے میں دیوار کے ساتھ لگی اسے دیکھتی رہی.....گاہے بگاہے ذکر اذکار کا سلسلہ بھی ہوتا رہا اور ماضی کا سفر بھی۔ بالخصوص تہجد کے وقت تو وہاں چاروں طرف نور برستا محسوس ہوتا۔کبھی کبھار دو چار خواتین بھی میری جیسی وہاں آ جاتیں.....سبز گنبد کے حوالے سے جتنے نعتیہ اشعار تھے وہ ذہن میں آتے رہے۔فجر کے بعد ناشتہ پھر رہائش گاہ کا چکر اور دوپہر میں پھر یہی مردانہ حصہ۔سامنے روضہ شریف کا سبز گنبد اور تاریخ کا سفر۔ایسے ہی دن کے وقت ٹھکانہ بدلنے کی ضرورت پیش آئی تو جنت البقیع کے نیچے برآمدہ بہت مفید ثابت ہوتا۔ایران، پاکستان اور ہندوستان کی کئی خواتین موجود ہوتیں۔ جب صفائی والے آتے تو ٹھکانہ بدل لیا جاتا۔ٹھکانہ بدلتے تو چہرے بھی بدل جاتے۔یہ جمعہ کا روز تھا اور میں جنت البقیع کے نیچے والے برآمدے میں بیٹھی تھی کہ میرے ساتھ دو لڑکیاں بھی بیٹھ گئیں۔

سلام دعا کا تبادلہ ہوا مجھے اب یاد نہیں پڑتا ان میں سے ایک جو گفتگو میں میرے ساتھ شریک تھی اس کا کیا نام تھا۔ہاں یہ اچھی طرح یاد ہے وہ دارالعلوم دیوبند کے بانیوں کی پوتی پڑپوتی تھی۔نازک دھان پان سنہری رنگت اور ناز و انداز والی۔وہ دارالعلوم دیوبند کے کسی بڑے منتظمین کی بہو اور بھاوج بھی تھی۔اپنے دینی پس منظر کا غرہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔جب صفائی والا اٹھانے آیا تو میں نے کہا۔انا مریضہ.....اس پر وہ مذاق اڑاتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اپنی ساتھی سے بولی ان کی عربی دیکھو.....کہتی ہیں انا مریضہ.....

کیوں میری عربی کہاں سے غلط ہے.....؟ میں نے تڑپ کر کہا..... میں کیا جانوں بس یہ پتہ ہے عرب آج کل یہ بولی نہیں بولتے.....اس نے اٹھلا کر کہا.....تم کو نہیں پتہ یہ بولی آج کل متروک ہو چکی ہے۔میں خاموش رہی اس معاملہ میں اس کی معلومات "اپ ٹو ڈیٹ" ہوں گی۔

تم نے یہ عربی کہاں سے سیکھی۔اس نے پھر مذاق اڑایا۔

قرآن پھیں سے.....میں نے کہا.....

اب اس کی خاموش رہنے کی باری تھی۔پھر اس نے اپنے وہ تمام کورسز اور ڈپلوموں کے نام گنوائے جو اسنے عربی سیکھنے کیلئے کیے تھے۔انہی باتوں کے ودران اس نے اپنی حکومت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے.....یہ میرے لیے بہت عجیب بات تھی اس لیے کہ میرے حلقہ احباب میں جتنے لوگ تھے انہوں نے کچھ یہی تاثر چھوڑا تھا کہ انڈیا میں بیتنوں کی حالت زار بہت ''دکھی'' ہے۔

اس نے قطعیت سے کہا۔بالکل جھوٹ۔تم لوگ ہمارے کو خوش نہیں دیکھتے ہماری حکومت نے ہمارا کتنا خیال رکھا ہے۔صرف ایک لاکھ دس ہزار روپے میں ہم حج کریں گے۔اچھا قیام اچھا طعام دس کلو آٹا، دس کلو چینی پانچ پانچ کلو دال چاول لانے کی ہمیں اجازت ہے اور اس رقم میں سے چالیس ہزار روپے ہمیں سعودیہ آتے ہی مل

گئے تھے۔ آپ بتاؤ آپ کی حکومت نے کتنے روپے لیے۔ کتنے واپس کیے......؟ کتنی کتنی دور کی بلڈنگوں میں پھینکا ہے۔

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ میں نے دل میں سوچا اور گفتگو کا موضوع بدلا کہ میرے دورہ قرآن میں ایک خاتون شامل ہوئی ہیں جو بیاہ کے انڈیا سے پاکستان آئی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ ہماری اماں ہمیں کمرہ لاک کر کے چھپ کے قرآن پڑھاتی تھیں...... بہت سختی ہے ۔یتہ نوں پر۔ اس نے اپنی ستواں ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

اللہ ہی جانے ہمارے علم میں تو انڈیا کا کوئی علاقہ ایسا نہیں......

۔یتہ ن جب چاہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہی دنوں پندرہ بیس ہزار ۔یتہ نوں نے مل کر ہندو وزیر کے خلاف جلسہ کیا تھا۔ ہم اپنے وزیراعظم کو ان کے سامنے مردہ باد کہہ سکتے ہیں۔ اس نے فخریہ کہا۔

اچھ......آ...... وہ تو ہمارے ملک میں بھی ہندو اور عیسائی جب چاہیں سڑکوں پر آ سکتے ہیں۔ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے ناں...... میں نے کہا۔

تو آپ اپنے وزیراعظم کو گالیاں دے سکتے ہو؟ وہ بدستور ہندوستانی جمہوریت کو تسلیم کروانے پر مصر تھی۔ پوری دنیا ہمارے وزیراعظم اور صدر کو گالیاں دے سکتی ہے۔ میں نے کہا لیکن پہلے بتاؤ تم لوگ ہجرت کر کے پاکستان کیوں نہیں آئے...... میں نے پوچھا۔

اس لیے کہ اللہ کے دین کی تبلیغ کیلئے کچھ ۔یتہ نوں کو وہاں رکنا چاہیے تھا۔ اس نے دلیل دی۔

تو تمہارا خیال ہے کہ اسلام تبلیغ کیلئے ہجرت نہ کرنے کا کہتا ہے۔ ایسے نہیں اسلام تو پھیلنے کیلئے خود ہی راستے منتخب کرتا ہے۔ میری بات اسے سخت ناگوار گزری۔ اس نے منہ کا ذائقہ بدلنے کو کہا۔

تو اس ملک میں نہ آ کر ہم نے اچھا ہی کیا جہاں کے صدر اور وزیراعظم رشوت خور ہیں۔

اچھا......؟ میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے صدر اور وزیر عظم صاحب تمہارے صدر صاحب سے پھر بھی اچھے ہیں۔

اف یہ کہنا تھا کہ اس کی وطنیت پر وہ زد پڑی کہ الاماں......بیس منٹ اس نے اپنی حکومت کے گن گائے......

اس بحث سے کیا فائدہ میں نے دل میں سوچا......اور کہا

بی بی تم کہتی ہو تمہارے حکمران اچھے ہیں ہمارے حکمران لاکھ برے سہی لیکن اس مقدس مقام پر وہ دس دفعہ آ چکے ہیں حج کر چکے ہیں......بس یہ بتا دو تمہارے حکمران اپنی زندگی میں کتنی دفعہ یہاں آئے ہیں......

اس نے تیکھی نظر سے مجھے دیکھا...... بولی کچھ نہیں بس ہینڈ بیگ اٹھا کر تنتناتی ہوئی جنت البقیع کا برآمدہ چھوڑ کر ٹھکانہ بدل لیا۔

☆☆☆

کراچی سے ڈھاکہ تک

ایک 'پاکستانی' خاتون کی سرگزشت

تحریکی حلقوں کے لیے میرے بڑے بھائی، خرم مراد کے اہل خاندان اجنبی نہیں۔ محترمہ نیر بانو صاحبہ (اللہ ان کے درجات بلند کرے) ہماری خالہ زاد بہن تھیں۔ ان کی تحریروں میں ہماری والدہ کا ذکر آیا ہے۔ ''لمحات'' میں خرم بھائی نے والدہ اور بہن بھائیوں کا اچھا خاصا تذکرہ کیا ہے۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن شیما سعدیہ کی شادی ایک معزز بنگالی خاندان کے نوجوان مشید حسین ہمایوں سے ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ یہ شادی خرم بھائی کے ڈھاکے کے قیام کے دوران ہوئی۔ اس کے بعد شیما نے وہیں زندگی گزاری۔ سقوط ہوا، خرم بھائی ڈھاکے میں نہ رہے۔ ہمایوں کا ۱۹۹۶ء میں سرطان میں انتقال ہوگیا۔ میں نے شیما سے کہا کہ اپنی خودنوشت لکھو۔ تمھاری تو مثالی ہے کہ ایک بالکل مختلف معاشرے میں، تحریک سے تعلق کی بنا پر، تمھیں قبول کیا گیا، اور تم نے بھی حق ادا کیا۔ اس نے ابتدائی طور پر یہ تحریر لکھی۔ اگر قارئین نے پسند کیا تو ان شاء اللہ وہ مکمل خودنوشت لکھ سکے گی۔ سب ہی پڑھنے والوں کے لیے بہت سبق ہوں گے۔ اپنے تاثرات سے مدیرہ بتول کو آگاہ کیجیے۔ (مسلم سجاد)

☆☆☆

اپنے بھائی کے اصرار پر قلم تو اٹھا لیا، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں؟ کیسے لکھوں؟ کہاں سے لکھوں؟ شاید اس لیے بھی کہ اچھی اردو لکھنا میرے لیے بہت مشکل ہوگیا ہے۔ خطوط کے سلسلے میں یہ سننے میں آتا رہا کہ اردو بہت خراب ہوگئی، بقول لوگوں کے اب تو بولنے میں بھی روانی نہ رہی۔ بنگال میں آئے ہوئے مجھے ۴۳ سال ہو چکے ہیں۔ اب تو بنگلہ بولنا ہی آسان لگتا ہے۔ لکھنا بالکل نہیں آتی، ہاں کام چلانے کے لائق پڑھ لیتی ہوں۔ راستوں میں بورڈ سمجھ میں آجاتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ سمجھ نہیں آتے تھے تو بہت خراب لگتا تھا۔ بنگلہ سیکھنے پر کبھی توجہ نہ دی، جو خود سے آگئی وہ آگئی۔

بنگالیوں کی اور ہماری معاشرت میں ہر طرح سے ہی بہت فرق ہے۔ زبان ہو یا لباس، اب تو قمیص شلوار بہت عام ہے۔ اب سے چالیس سال پہلے اس کا تصور نہ تھا کہ کوئی شادی شدہ لڑکی قمیص شلوار پہنے، البتہ مجھے اپنے شوہر کی طرف سے پوری چھوٹ ملی ہوئی تھی اس لیے میں آرام سے پہنتی تھی۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو میری نند ساڑھی ہاتھ میں لائی اور یہ کہا اب تو تمھیں ساڑھی پہننا ہوگی، شلوار قمیص کی وجہ سے شاید پاکستانی سمجھی جاؤ گی۔ بہرحال وہ تو انتہائی پریشان کن لمحات تھے جب ہماری فوج ہتھیار ڈال کر جا رہی تھی۔ جو ساتھ رہے وہ اندازہ کرسکتا ہے کہ ہر چیز میں اختلاف، کھانا پینا ہو یا رکھ رکھاؤ۔ اللہ کی خاص رحمت نہ ہوتی تو ایڈجسٹ ہونا بڑا مشکل تھا۔ جس ماحول میں پرورش پائی، اس میں یہ نہیں سیکھا تھا کہ اپنی بات منوائی جائے یا زور آوری کی جائے۔ چپ رہ کر ہر بات مان جانے کی تربیت ہی کام آئی۔ اس بات میں مجھے بڑی بھلائی لگی۔ سسرال میں نئے نئے آکر قربانیاں دے کر ہی جگہ بنتی ہے، جھنڈے گڑتے ہیں، عزت بنتی اور بڑھتی ہے۔

ہماری اماں یوپی کی، ابا پیٹ پور کے اور میں پوری پاکستان کی ہوں۔ سب کے ساتھ تین چار سال کی عمر میں پاکستان آگئی تھی۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے بہت پیار ملا، جس کا احساس اس وقت نہ تھا۔ اماں کے تعلق کا انداز ذرا مختلف ہی تھا۔ محبت

بھی، خیال بھی اور تربیت بھی۔ ڈانٹ بھی کبھی نہیں پڑی، کوئی سخت بات بھی کبھی سننے کو نہیں ملی۔

ابا شروع میں پنجاب کے دوروں پر رہتے تھے۔ جب آتے اپنے پاس سلاتے تھے۔ مجھے لگتا ہے ابا بھی مجھے پیار کرتے تھے۔ جب کراچی میں ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن میں کام کرتے تھے تو مجھے بھی اپنے آفس لے جاتے تھے۔ گاندھی گارڈن کے گھر میں ابا رات کو میرے لیے عید کے کپڑے لائے۔ رات میں سلائی ہوئی، ہاتھوں پیروں میں مہندی لگی۔ میں اماں سے اپنی بہت سی باتیں منوالیا کرتی تھی۔ میرے ایک بھائی اکثر کہا کرتے تھے شیما کی اماں نے پٹائی نہیں کی، اس لیے یہ بگڑ گئی۔ البتہ یہ خیال تو بہت آتا ہے کہ ان سے بہت کچھ سیکھنے کا تھا جو نہ سیکھا۔ ہرفن مولا تھیں، یہی کہنا ٹھیک ہوگا۔ ہر کام میں پھرتی، بازار کا کام ہو یا گھر کا کھانا پکنا ہو یا سلائی کڑھائی، سلمہ ستارے کا کام، لحاف میں روئی ڈال کر نگندے ڈالنا، اسکول میں داخلے سے پہلے انگلش اردو فارسی کی پوری تیاری، پھر باتوں باتوں میں قرآن کا شوق دلانا، ایک ایک آیت کئی کئی بار پڑھو مزہ آئے گا، خود گھنٹوں قرآن پڑھا کرتی تھیں، حجۃ اللہ البالغہ پڑھو کوئی مسئلہ ہو تو بتا دینا۔ پتا نہیں، یہ شاید انسانی فطرت ہے، جو چیز دسترس میں نہ رہے اس کی بہت قدر آتی ہے۔ روزمرہ ہی اس کا مشاہد ہوتا ہے۔ اب یہی خیال آتا ہے کہ جو قدر کرنا چاہیے تھی، شاید نہیں کی۔ سیکھنے کا بھی بہت کچھ تھا لیکن الحمدللہ جتنی قربت ملی، جو دیکھا اس سے بھی میرے خیال میں بہت فائدے ہوئے اور زیادہ فرماں برداری کی ہوتی تو بہت اچھا ہوتا۔ اپنے تجربات میں بچوں کو بہت بتاتی رہتی ہوں، اماں کا ذکر بھی آتا ہی رہتا ہے، بچپن کی تعلیمات ذہنوں میں بیٹھ جاتی ہیں۔

بالآخر وہ وقت آ گیا جو ہر لڑکی پر آتا ہے۔ بڑا مشکل وقت ہی ہوتا ہے شاید۔ آزادی، بےفکری، پیار و محبت کا ایک ماحول، سب کا ایک تربیت اور سکھانے والا انداز ..... اب اس سے نکل کر ایک دوسری زندگی کا آغاز، ذمہ داریاں، کچھ تنقیدی نظریں ..... میرے لیے شاید یہ اس لیے کٹھن ہوا کہ کراچی سے ڈھاکہ، ایک بنگالی خاندان، ہرطریقہ اور ہرانداز ہی مختلف۔ میری دوستیں کہتی تھیں: تمھاری اماں کو کیا ہوگیا ہے، بنگالیوں میں شادی کررہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں کہتی تھی جوڑیاں تو آسمانوں پر بنتی ہیں۔ یہاں بھی یہ سوال بار بار ہوتا رہتا تھا۔ میں یہی کہتی رہی کہ اسلام اور تحریک کے علاوہ اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ میری ایک بہن کا کہنا تھا کہ ڈھاکا تو کالا پانی لگتا ہے۔ اپنی اپنی رائے ہے ..... بنگالیوں کے بارے میں ہمارے لوگوں کا تصور شاید اچھا نہ تھا اور نہ ہے۔ ہر جگہ اچھے برے لوگ ہوتے ہیں، اللہ کے بنائے ہوئے انسان ہیں، خوبیاں اور خامیاں ملی ہوئی ہیں۔

میں جن لوگوں میں آئی وہ اللہ کی رحمت، بڑوں کی دعائیں اور میری خوش قسمتی سے بڑے اچھے لوگ ہیں۔ ان لوگوں کی تعریف میں جتنا بھی کہوں، جو بھی کہوں کم ہے۔ میرے میاں کی خالہ زاد بھائیوں کی بیویوں سے بات چیت میں کبھی نندوں کا ذکر آجاتا تو میں تعریفاً ذکر کرتی اور وہ برائی سے ذکر کرتیں۔ آپ یہ کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ آپ بھی اچھی ہیں۔ میں سوچتی رہ گئی، تالی تو واقعی دو ہاتھ سے ہی بجتی ہے۔ ناپسندیدہ بات پر خاموشی اختیار کی، جوابی کارروائی کا تو کبھی سوچا نہیں ..... خاموشی ہی سب سے بہتر ہے، عافیت چپ رہنے میں ہے، بولنے سے بات بڑھتی ہے۔ اپنی خامیاں تو کسی کو نظر نہیں آتیں، اپنا دفاع بےکار ہے، پھر صبر کا بڑا اجر ہے۔ اچھی اچھی کتب زیر مطالعہ رہیں تو دماغ اچھا کام کرتا ہے۔ شیطان تو خون میں دوڑ رہا ہے، کتنے وسوسے اور خیالات ذہن کو پراگندہ کرنا چاہتے ہیں ..... مگر وہی ایک بات، سسرال تو سسرال ہی ہوتی ہے نا ..... بڑے نازک رشتے اور معاملات ہوتے ہیں۔ اپنے سگوں میں ہی رشتے کرنے سے کتنی دراڑیں پڑ جاتی ہیں ..... بہرحال پورے دو ماہ میں پوری اپ سیٹ رہی، آنکھوں سے آنسو تھمتے نہ تھے، مجھے خود ہی تعجب ہوتا تھا کہ مجھے کیا ہوگیا؟ بڑا زعم تھا کہ مضبوط دل والوں کے خاندان سے ہوں۔ کینیڈا سے میرے بھائی نے لکھا: تم نے تو رونے کے سارے ریکارڈ

جیسے ہماری غذا روٹی، ایسے ان لوگوں کی غذا بھات ہے، جو میں اب تک نہ اپنا سکی، حتیٰ کہ اب تو پلاؤ بھی نہیں اچھا لگتا۔

توڑ دیے۔

تھوڑا سا اُس خاندان کے افراد کے بارے میں بتاتی چلوں جن کا میرا ساتھ رہا۔ جن لوگوں نے بڑی محبت دی، بڑی قدر کی۔ مختصر سا گھرانہ، دو نندیں، دو دیور سب چھوٹے، ایک نند شادی شدہ، اب تو خیر سب کی شادیاں ہوگئیں، اور ایک عدد سوتیلی ساس، بڑی زبردست شخصیت۔ ایک نام سے سارے خاندان میں پہچانی جاتی تھیں (ڈھاکہ کی اردو بولتی تھیں) تیز رفتار بولتی تھیں۔ ہر ایک ان سے ڈرتا تھا (خرم بھائی کہتے تھے: اویس (خرم بھائی کا 'خصوصی' بیٹا) کو شیما کی ساس کے پاس چھوڑ دو، بولنا سیکھ جائے گا)۔ میری نندوں کو کم نہ سناتی تھیں تو پھر میں بھلا کون؟ میں خاموشی سے ہی ان کی پسند کے کام کر دیتی تھی، جیسے صبح کی چائے وغیرہ۔ پھر اپنے کمرے میں بھی بلاتی تھیں، میرے بچوں پر تبصرے، برے بھی بھلے بھی، چھوٹی چھوٹی سی باتیں، لیکن پھر تعلق بھی، میلہ سے کھلونے لا لا کر دینا۔ میرے لیے اچار چٹنی حلوے بھی بنا کر دیتی تھیں۔ میری سگی ساس کا ۲۶ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا جب میرے میاں دس سال کے اور چھوٹی نند ایک سال کی تھی..... ان کے مرنے کے بعد میرے سسر کی ان سے شادی ہوئی، بیوہ تھیں (ایک نواسی ان کی سگی ہے جو ہماری ہم عمر ہوگی، وہ ہے)۔ اپنے دکھ کی کہانیاں بہت سناتی تھیں جو ان اولاد کس طرح ختم ہوئی، میں بہت دلچسپی سے سنتی تھی، اس لیے بھی مجھ سے خوش تھیں۔ میری شادی کے دس سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

جب میرے میاں انٹرمیڈیٹ میں تھے سسر کا بھی انتقال ہو گیا۔ ماں باپ کی توجہ سے محرومی کا اندازہ ان بہن بھائیوں کی زندگیوں کو دیکھ کر ہوتا تھا۔ میری نند کہتی تھی: ماں کی محبت اور پیار کیا ہوتا ہے، ہم نے تو سمجھا ہی نہیں، شاید اسی وجہ سے بچوں کو اتنا پیار دیا کہ وہ ان کی تربیت کے لیے غلط ثابت ہوا۔

اب اس ہستی کا ذکر جس کے ناتے سے میرا بنگلہ دیش آنا ہوا، پہلے ہی ہونا چاہیے تھا۔ ۲۷ سال کا ساتھ تھا۔ صاف دل، صاف بات، ہر ایک کا خیال، نرمی و ملائمت، کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ حسن ظن کی انتہا ..... کبھی کسی کے خلاف کچھ بولنا یا غیبت نہیں۔ دوسروں کی خوشیوں اور کامیابیوں پر ایسے خوش ہونا جیسے اپنا ہی کچھ ہوگیا..... ایک ایسا خاندان جس میں فلم ایکٹریس بھی تھی، ٹی وی آرٹسٹ بھی، گانے ناچنے والی بھی۔ ایسے گھرانے سے کسی کا تحریک سے وابستہ ہونا بہت بڑی بات تھی۔ اُن کا کہنا تھا گھر میں رائج شدہ بہت سی رسومات ختم کروائیں۔ بات کی وقعت تھی، میری بہت باتیں مان بھی لی جاتی تھیں۔ دلوں کے اچھے لوگ ہیں، اس لیے ان سارے نظریات و اختلاف کے باوجود آپس میں تعلق و محبت کا بڑا اچھا انداز تھا۔ ہوم سیکرٹری سگے خالہ زاد بھائی کا اصرار ہوتا تھا جماعت چھوڑ دو۔ سنگھرام کے سلسلے میں ایک بار کورٹ جیل ہوا تو اس نے ہی بہت مدد کی۔ چیف جسٹس سگے ماموں تھے، وہ بھی پسند نہ کرتے تھے.....

بہرحال میرے لیے تکلیف کا باعث ان کی ایک صفت تھی 'غصہ' .....چھوٹی اور معمولی بات پر۔ ایسے وقتوں میں چپ رہنا ہی مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ الحمدللہ کبھی جوابی کارروائی نہ کی اس لیے تو تڑاخ کی نوبت نہ آئی ..... جلدی ہی غلطی کا احساس، شرمندگی اور ندامت، لیکن پھر وہی صورت حال سامنے آجاتی تھی۔ ایسے وقتوں میں صفائی پیش کرنا یا کچھ بولنا تو بات بڑھاتا ہی ہے۔ میں تو ہنس کر کہتی تھی ڈرامے ہو رہے ہیں، ریہرسل چل رہی ہے۔ مزاج نارمل ہونے پر خاصا سنا لیا جاتا تھا۔ کہتے تھے: ''اماں نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی، تم کو بیرسٹری پڑھانا چاہیے تھی۔'' میری نند نے کہا: جب تمھارے ساتھ غصہ کریں تو چار بچوں کو لے کر چلی جانا۔ یہ سب تو شاید جذباتی فیصلے ہوتے ہیں۔ ایسی باتیں تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینے کی ہوتی ہیں۔ میری بڑی بیٹی کی شادی کے بعد اچانک ہی کسی بات پر بگڑ کر بولے: میرا تمھارا ایک ساتھ رہنا ناممکن ہے۔ میں نے کہا: ٹھیک ہے، زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ میں اپنے بھائیوں سے مشورہ کر کے کروں گی۔ بس پھر یہ بات آئی گئی ہوگی۔

شادی کے اٹھارہ سال بعد گھٹنوں کا درد شروع ہوا۔ تھوڑا بہت سلسلہ چلتا رہا۔ ۱۹۹۳ء میں کینسر جیسے مہلک مرض کا پتا چلا (ہڈیوں کے گودے میں ملٹی پل مائیلوما)۔ ڈیڑھ سال تکلیفیں اٹھائیں، شروع ریڑھ کی ہڈی سے ہوا، اس لیے باقی وقت پلنگ پر ہی گزرا۔ بالآخر وہاں پہنچ گئے جہاں سب کو جانا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پندرہ پندرہ دن کروٹ نہیں لی جاسکتی تھی، سارا وقت انتہائی صبر سے گزارا۔ پانچ بار اسٹریچر پر ہسپتال آنا جانا رہتا اور خون چڑھانا ہوتا رہا..... سارا وقت نماز کی پابندی، دعائیں، وظیفے، رات کو پابندی سے سورۂ واقعہ کا پڑھنا، معوذتین، مرنے سے چند دن پہلے کہا: قرآن لاکر مجھے سورۂ غاشیہ سناؤ، بس اب دعا کرو کہ جنت میں اللہ ایک ساتھ رکھے، آمین! اپنی طرف سے خدمت کی کوشش کی مگر پھر بھی افسوس آجاتا ہے اس لیے میں اپنی لڑکیوں کو سمجھاتی ہوں، اپنی طرف سے کوئی کمی نہ رکھو، کسر نہ رہ جائے کہ بعد میں افسوس آئے۔

جب میں یہاں آئی تو بنگلہ کا ایک لفظ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میرے میاں اچھی اردو پڑھ اور بول لیتے تھے اس لیے مسئلہ نہ ہوا۔ اب تو ماشاء اللہ سب بچے اردو سمجھ لیتے ہیں۔ کوئی کوئی بول بھی لیتے ہیں اور دو تین تو اردو سے بنگلہ ترجمہ کر لیتے ہیں۔

یہ ایک زمیندار فیملی ہے اس لیے رکھ رکھاؤ بھی زیادہ اور کھانے میں اہتمامات بھی بہت زیادہ، جبکہ ہمارے ہاں کھانے کا معاملہ بہت سیدھا سادا، اس لیے یہ مسئلہ میرے لیے خاص طور پر پریشان کن تھا۔ گھبراہٹ ہوتی تھی۔ دباؤ میں آکر انسان بہت کچھ سیکھ لیتا ہے۔ ویسے بقول میرے، زمینداری تو چولہے میں گئی، خون میں جو باقی رہ گئی وہ بھی مشکل بن گئی۔ کچھ عرصے بعد مجھے کھانے پکانے کا شوق ہو گیا اور میرے خیال میں مردوں کو اچھے کھانے کھلانے کے فائدے ہی ہیں۔ اس فن کو بہت کم توجہ سے سیکھ لیا جاتا ہے۔ میں کہتی تھی میرے گھر والوں کو یقین نہ آئے گا کہ میں کیا کچھ پکا لیتی ہوں۔ میرے پکائے حلیم کی بہت تعریفیں، یہاں رمضان میں حلیم کا عام رواج ہے۔ دہی بڑے میری وجہ سے شروع ہوئے، چھولے اور حلیم۔ یہ سب چیزیں تو ہمارے ملک کی ہیں۔ ان لوگوں کے کھانے پہلے مشکل لگتے تھے، پھر تو الحمدللہ دیکھ کر بہت سیکھے پکائے۔ بہت تو ایسے بھی تھے جو میں نہیں کھاتی تھی۔ جیسے ہماری غذا روٹی، ایسے ان لوگوں کی غذا بھات ہے، جو میں اب تک نہ اپنا سکی، حتیٰ کہ اب تو پلاؤ بھی نہیں اچھا لگتا۔ اتفاق سے میں جس گھر میں آئی یہاں رات کو روٹی کا رواج تھا۔ یہ میرے لیے بہت اچھا رہا۔ رمضان میں تو اب بھی اپنا گھر یاد آجاتا ہے۔ کچھ مخصوص لوازمات افطار میں ضروری ہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو۔ میری وجہ سے شاید میرے گھر میں وہ لوازمات نہیں چلتے۔ ویسے بھی چاول سے زیادہ آٹا ہی خرچ ہوتا ہے۔ میرے بچوں میں دو طرف کا اثر آ گیا۔ نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے.....

ویسے میں اس ماحول میں رچ بس گئی ہوں۔ بنگالیوں میں ہندو کلچر کے بہت اثرات لگتے تھے۔ اب تو میں بھی عادی ہو گئی۔ شروع میں میں کہتی تھی تم لوگوں کا کلچر ہی ناچ گانا، رنگ رلیاں کرنا ہے لیکن اب شاید کچھ کہنے کا نہیں رہا۔ اس لیے کہ پاکستان کا حال بھی کچھ اچھا نہیں لگتا ..... دامادوں کی یہاں خوب خاطریں ہوتی ہیں، سر پر ہی چڑھاتے ہیں، میرے گھر میں میری وجہ سے ذرا کم ہی رہتا ہے۔ کہہ بھی دیتی ہوں، میری وجہ سے کمی ہو رہی ہے۔ خیر وہ لوگ بظاہر تو مانتے نہیں، ماؤں کا لڑکیوں کے گھر میں جا جا کر رہنا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارا تو اس بارے میں دوسرا ہی تصور تھا۔ میرے گھر میں جب اماں آکر رہیں تو کہا یہ پہلی بار ہے کہ میں کسی لڑکی کی سسرال میں رہی ..... یہ بھی سننے کو ملا کہ میں کیسی ماں ہوں، لڑکیوں کو چھوڑ دیا وغیرہ۔ اولاد کی محبت تو اللہ کی طرف سے ہے، شاید اظہار کم ہوتا ہو۔ اماں کہتی تھیں مائیں اگر لڑکیوں کے گھر کے پاس رہیں یا معاملات میں دخل دیں تو گھر نہیں بنتے۔ بات بڑی صحیح لگتی ہے۔

سب انسان ہیں، فرشتے تو نہیں، نیت خراب نہ ہو تب بھی کتنی باتیں چبھ جاتی ہیں۔ ہر بات تو اپنی پسند کی نہیں ہو سکتی۔ بہت سی باتیں

سن کر بھی چپ رہنا ہی سب سے اچھا لگتا ہے۔ سب سے اچھا نسخہ: سن کر چپ ہو جاؤ، چہرے سے اظہار بھی نہ ہو۔ بہت کم ہی کسی کو اندازہ ہوا کہ مجھے کوئی بات بری لگی۔ یہ رشتے اتنے نازک ہوتے ہیں کہ خرابی آتے دیر نہیں لگتی۔ برداشت کرنے میں ہی سب سے زیادہ فائدے ہیں..... سگے رشتوں کی بات ہی دوسری ہوتی ہے۔ میں شاید دور ہوں تو مجھے تو بڑی قدر آتی ہے۔ دور کے ڈھول بڑے سہانے ہوتے ہیں۔

اسلام میں بھی صلہ رحمی کی کتنی تاکید ہے۔ میرے میاں کے بعد سسرال والوں کا انداز اور بھی زیادہ خیال و محبت کا ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل کو ڈھارس ملتی تھی۔ میں اپنے دیور کے ہاں گئی تو آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ کہا ''تم آتی ہو تو لگتا ہے بڑے بھائی آ گئے'' میں بڑی متاثر ہوئی۔ ۱۹۸۲ء میں سیڑھی سے گر کر پیر کی تین ہڈیوں میں فریکچر ہو گیا، گھٹنے تک پلاسٹر چڑھا۔ ایک ماہ میری نند کھانا بھیجتی رہی، دوسرے بھی تعجب کرتے تھے۔ بنگلہ دیش قائم ہونے کے وقت ہر طرح کے آرام اور حفاظت کا خیال، کہاں میں آرام سے رہ سکوں گی۔ پھر راتوں میں وقتاً فوقتاً دیکھنے جانا۔ اللہ ہی جزائے خیر دے گا، احسان ہی احسان، فراموش تو نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے بچوں کو میں بہت سمجھاتی ہوں، اب نئی نسل تو دوسری طرح کی ہے۔

بہر حال اب تو میرا زندگی کا تیسرا دور شروع ہو چکا ہے۔ کتنی مہلت عمر ہے معلوم نہیں۔ اللہ کی رحمت و مہربانی سے گزر گئی، بہت اچھی گزری۔ جتنا بھی شکر کروں کم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہی ہوتی ہے اور اس کو اپنے بندوں سے بڑی محبت ہے تو میری بھلائی یہاں آنے میں ہی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ سے بڑی امیدیں ہیں۔ جب دنیا کی زندگی میں اتنی رحمتیں و مہربانیاں کی ہیں تو آخرت میں بھی بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخلہ دے دیں گے۔ بڑا ڈر لگتا ہے، گناہوں کا بوجھ ہے، استغفار کی کوشش ہے، کوئی چھوٹی سی نیکی ہی بیڑا پار کرا دے۔ ایک طرف جنت میں جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سوئی کے ناکے سے اونٹ کا نکلنا، دوسری طرف کلمہ پڑھنے والا جنت میں چلا جائے گا۔

ماشاءاللہ میرے آٹھ بچے ہیں، چھ کی شادیاں ہو گئیں۔ پوتے پوتیاں، نواسے نواسیوں کی تعداد ماشاءاللہ ۱۸ ہے۔ (۴ ماہ بعد ان شاء اللہ ۲۰ ہو جائے گی)۔ یہ پوری فوج انٹرنیشنل ہے، امریکن، کینڈین، برٹش، پاکستانی اور بنگالی..... گزشتہ سال میری نواسی کی شادی ہو گئی۔ ایک اور نسل چل پڑے گی۔ وہی لوگ جو بچوں کی پیدائشوں پر تبصرے کرتے ہیں، کہتے ہیں: ''تمھارا ہی بھرا گھر اچھا ہے۔''

❁❁❁❁

اردو کی فریاد

یہاں میں سسکیاں بھرتی ہوں.....تو.....سمندر پار انگریزی چیخیں مارتی ہے

اجی کہاں کو چلتے ہیں صاحب.....؟ ہم سے تو ملتے جایئے.....

خادمہ کو ''اردو'' کہتے ہیں.....دکن کے ولی نے ہمیں گودی میں کھلایا ہے تو میرؔ نے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا ہے۔

اللہ بخشے اماں باوا کو.....انہوں نے تو ہمارا نام لشکری زبان رکھا تھا۔ بعد ازاں ہمارے کسی چاچے تائے نے بدل کر اردو رکھ دیا جس کے معنی بھی بہر حال لشکر کے ہی ہوتے ہیں۔

ہم تقریباً تین سو سال پہلے وجود میں آئے۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے اپنے اپنے لشکروں میں مختلف علاقوں کے لوگوں کو بھرتی کیا مثلاً عربی، ایرانی، ہندوستانی وغیرہ۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے ان تمام لوگوں کی زبانیں مختلف تھیں۔ بس ان کے میل جول سے ہم نے جنم لیا۔ چونکہ ہم مسلمانوں کے لشکر میں بولی جانیوالی زبان تھے اس لیے ہمیں لشکری زبان اور مسلمانوں کی زبان کا نام دیا گیا۔ مختلف ادوار میں ہمارے مختلف نام رکھے گئے۔ مغربی مصنفین نے ہمیں مورس (مسلمانوں کی زبان، اردو) کہا تو ہمارے اپنے آبا نے ریختہ زبان۔

اس کے علاوہ ہندوی، ہندی، ہندوستانی، برج بھاشا، اردو معلیٰ بھی ہمارے ہی نام ہیں۔ اب ہم صرف اردو کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

خوبصورتی کا راز کیا بتائیں۔ بس سودا کے قصیدوں نے فیئر اینڈ لولی کا کام کیا تو مومن کے دیوان نے فائزہ بیوٹی کریم کا.....

تایا اقبالؔ نے بڑی محبت سے ہماری بے رنگ ہتھیلی رچائی اور حالیؔ نے بڑی چاہ سے ہماری مانگ کو خلوص کی افشاں سے بھر دیا۔ فانیؔ کی الفت نے تو ہماری پلکوں پہ ستارے ہی بکھیر دیئے۔ غالبؔ رشتے میں لگتے تو ہمارے چچا تھے لیکن بہت محبت سے ہمیں اپنی پکی سہیلی کہا کرتے تھے۔

ایک زمانے میں حقیقتاً ہمارے بڑے مداح تھے جو ہمیں نہایت محبت سے میٹھی زبان کہا کرتے تھے۔ آئے ہائے..... کیا بتائیں صاحب..... وہ چچا غالبؔ کے ہاں ہونے والی بڑی بڑی محفلیں..... وہ سیالکوٹ کی یخ فضاؤں میں جنم لینے والے تایا اقبالؔ کی ہم سے گرما گرم الفت..... اور ڈپٹی صاحب..... (مشہور زمانہ کتاب توبتہ النصوح) کے مصنف کے قلم کی روانی سے موتی بنتے خوبصورت الفاظ.....اللہ اللہ.....ہمیں خود پہ فخر ہی تو ہونے لگتا ہے۔ ایک شان سے داغؔ کے آنگن میں چنبیلی کے پھول کی طرح مہکا کرتے تھے۔ اب وہ دور کہاں.....اور وہ باتیں کہاں۔

دور حاضر کے نونہالوں کا حال ملاحظہ کیجیے:

چند روز قبل کا ذکر ہے ایک دس گیارہ سالہ بچی اپنی ہمشیرہ سے کہنے لگیں: باجی! ہمارے سکول میں اردو بولنے کی اجازت نہیں..... سب انگلش بولتے ہیں.....ٹیچر (استانی) نے سختی سے منع کیا ہے کہ اگر کوئی اردو میں بات کرے تو اس کی بات کا جواب ہی نہ دو۔

ہمشیرہ حیرت سے بولی: ارے کیوں؟

دیکھیں نا باجی! اگر کوئی ایک دم سے بہت امیر ہو جائے تو کیا پھر اسے انگلش بولنے میں مسئلہ نہیں ہوتا؟

کیا پتے کی بات کی ہے بچی نے! اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اب ہم فقط غریبوں کی زبان ہیں۔

ارے مداحوں کی بات کیا کرتے ہیں وہ تو چچا غالب و خسرو کے زمانے کی باتیں تھیں۔ اب تو اپنے بولنے والوں کی تعداد ہی گھٹ

کر دو فیصد رہ گئی ہے۔اور جو بولتے ہیں وہ بھی دوسری زبانوں کا تڑکا لگا کر ہمیں برابر گلابی کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اس پہ ہمیں یاد آیا کچھ روز قبل ایک بچی اپنے ہم عمر ایک بچے کو سائیکل پہ بٹھائے جھولا دے رہی تھی۔زور سے دھکا دینے پہ سائیکل دائیں بائیں بری طرح سے ڈولی..... ماں نے آگے بڑھ کر گھرکا.....کیا کر رہی ہو.....

تو ننھی بے بی غصے سے بولیں.....اس نے بھی مجھے اتنی ہی زور سے چوٹا (جھولا) دیا تھا.....

واللہ جی چاہا اسے کہیں کہ وہ ہمیں بھی اتنی ہی زور زور سے چوٹے دے رہی ہے.....مجال ہے جو ماں نے بچی کی غلطی نکالی ہو۔ الٹا ہنس ہنس کر سب کو بتانے لگیں..... بچی پھولی نہ سمائے کہ نجانے اس نے کتنی عمدہ بات کی ہے.....

ارے حضرت یہ تو بچی کی بات تھی یہاں تو بڑے میاں بھی سبحان اللہ ہیں.....لیکن پنجابی کے تڑکے لگانا ان کے شایان شان نہیں وہ ہمیں اپنی انگریزی سے گلابی کرتے ہیں.....

ابھی چند روز قبل بی انگریزی کا ہمارے ہاں آنا ہوا..... بہت روہانسی ہو کر گلہ کرنے لگیں کہ تم ہی اپنے لوگوں کو کچھ سمجھاؤ.....آخر کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں کیا مار کر ہی دم لیں گے.....

ہم نے کہا کچھ بتائیے تو آخر ماجرا کیا ہے۔

کہنے لگیں..... ارے ہونا کیا ہے..... ابھی یہاں کی مارکیٹ سے گزر رہا..... ایک شاندار سے پلازہ کے دکاندار صاحب اپنے گاہک سے دریافت کر رہے تھے: آپ لاہور سے ہی بی لیو کرتی ہیں؟

گاہک حیرانی سے: جی؟

مجال ہے جو اپنی غلطی کا ذرا سا بھی احساس ہوا ہو دوبارہ اسی اعتماد سے پوچھنے لگے.....لاہور سے بی لیو کرتی ہیں آپ؟

یقیناً بڑے میاں بی لونگ (تعلق رکھنا) کو بی لیو کہہ رہے تھے۔

ہم نے کہا مادام! ہم آپ کی کیا سنیں اور کس کو سنائیں.....

یہاں تو دن رات اپنے بدن کی ٹکور کرتے گزرتا ہے۔ظالموں نے مار مار کر بھرکس نکال دیا ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں ایسی روانی سے بکس (Books) لائٹیں (Lights) پلیٹیں (Plates) چاکلیٹیں (Chocolates) پارٹیاں (Parties) جیسے الفاظ بولتے ہیں کہ ہماری پوری چمڑی رنگی جاتی ہے لیکن مجال ہے کہ کسی پہ کوئی اثر ہو۔ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔

اب تو یہ آئے دن کا معمول ہے۔دور حاضر کے نوجوان ایک دھڑلے سے ہماری ٹانگیں توڑ کر ہمیں ''نیلو نیل'' کر دیتے ہیں۔ (آخر ہم بھی زیر اثر آ گئے!) ایک دھڑلے سے سنڈے والے دن، سوموار والے دن، (وار= دن) جیسے شاندار الفاظ استعمال کرتے ہیں روانی سے بولتے جملوں میں آخری لفظ حذف کر جاتے ہیں۔اب تو ایک عرصہ ہوا کان ترس گئے اپنا اصل نام سنے ہوئے.....آنکھیں ترس گئیں اپنی خالص حالت دیکھے ہوئے.....آج کے نوجوان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ مجھے پورے تلفظ کے ساتھ ادا کرے کیسے او (ہو)۔

میں وی (بھی) ٹھیک اوں (ہوں)۔

اتّے (اندھے) ہو؟ آگے سے بس آ رئی اے (رہی ہے)۔

اپنی قسمت ای (ہی) خراب اے (ہے)۔

اوئے پاغل.....

ایسے میں اگر کوئی صحیح جملے ادا کرے تو مذاق اڑا اڑا کے اس کی مت ماردی جاتی ہے۔

میرے وجود کے انتہائی ضروری حصے مذکر مونث کی تو خیر بات ہی چھوڑ دیں وہ تو گویا کسی شمار و قطار میں ہی نہیں آتے.....اچھے خاصے باشعور اور پڑھے لکھے لوگ اس کے چیتھڑے اڑاتے نظر آتے ہیں.....

ہماری ٹرپ گئی ہے..... پوائنٹ آ گئی ہے..... درد ہو رہی ہے.....خواب دیکھی تھی..... اخبار پڑھی تھی..... دہی کھٹی ہے..... وغیرہ وغیرہ۔

انگریزی کے خبط میں مبتلا گھرانوں نے کبھی اپنے بچوں کی اردو سدھارنے کی کوشش نہیں کی..... انہیں جدید دور کیلئے انگریزی کی ضرورت ہے۔انہیں نقال بندر بننا قبول ہے.....لیکن اپنی پہچان کی بقا ان کیلئے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

ارے ساتھیو! میری طرف سے آپ جو مرضی زبان بولیں مجھے گلہ نہیں۔میری بس آپ سے اتنی سی گزارش ہے کہ مجھے نیلا گلابی کرنا چھوڑ دیں۔ مجھے میرا اصل لوٹا دیں۔ مجھ سے میری پہچان مت چھینیں۔آپ کو غلط انگریزی بولنا گوارا ہے لیکن درست اردو بولنا آپ کی شان کے خلاف ہے..... یہاں میں سسکیاں بھرتی ہوں تو سمندر پار انگریزی چیخیں مارتی ہے۔

اسی پہ چلتے چلتے ایک واقعہ سناتی چلوں۔

ایک یونیورسٹی کی طالبہ اپنی سہیلی سے کہتی ہیں:

تم نے مجھے Condole نہیں کیا نا.....

سہیلی ایک دم حیرت زدہ.....کیا مطلب؟

مجھے Colndole کرو آج میں بہت پریشان ہوں۔

محترمہ Console (تسلی دینا) کو Condole (تعزیت کرنا) بول رہی تھیں!

دونوں الفاظ کا فرق آپ خود ہی ملاحظہ کریں.....اور ہمارے حالات کو سدھارنے کیلئے میرے ساتھ دعا گو رہیں۔

☆☆☆

چلتے چلتے

قارئین کرام! نیٹو سپلائی بحالی کی آڑ میں پاکستانی قوم کا سودا۔ ان کی غیرت ملی و مذہبی کا سودا محض 365 کروڑ ڈالر میں کر دیا گیا ہے۔ وہ قوم جسے اقبال نے خاص کہا تھا ترکیب میں کہ یہ رسول ہاشمیؐ کی قوم ہے۔قومے فروختند، چہ ارزاں فروختند۔365 کروڑ ڈالر کی پاکستانی فضاؤں، ہواؤں، خون مسلم، شان مسلم، آن مسلم کے آگے حیثیت ہی کیا ہے بھلا؟ ارے اللہ کے بندو! ہمارے سر پر مسلط فیصلہ سازو! ہمارے 'زیرک' حکمرانو! اتنی رقم تو وطن عزیز کے صنعتکار دے دیتے۔ ہمارے بیرون ملک مقیم پاکستانی ہم وطن عطیہ کر ڈالتے۔عوام سے اپیل کرتے کہ امریکہ کو یہاں سے ہمیشہ کے لیے بے دخل کرنا ہے تو پھر اقتصادی پابندیوں کا مقابلہ کیسے کریں تو جذبوں سے سرشار پاکستانی عوام ایک دو سال پیٹ پر..... جی ہاں اپنے خالی پیٹ پر پتھر باندھ لیتے مگر اتنی رقم ضرور اکٹھی کر لیتے۔ارے آپ اشارہ تو کرتے ہمارے ہاں کے امیر ترین خاندان جو چند ایک نہیں اب سینکڑوں میں ہیں وہی اپنی اپنی تجوریوں کو تھوڑی ہوا لگوا دیتے۔اور تو اور ہماری بیگمات اور خواتین ارکان پارلیمنٹ سال بھر میک اپ نہ کرتیں تو بھی کافی رقم جمع ہو سکتی تھی۔انہی دنوں بحریہ ٹاؤن کے ریاض صاحب نے 13 کروڑ روپے دے کر قذاقوں سے عملے کے لوگوں کو رہا کروایا ہے۔ ایسے کئی ریاض ہماری قوم میں موجود ہیں آپ خود کردار ساز کردار تو ادا کرتے۔اللہ رب کریم نے مشرف صاحب کی بزدلی کے بعد قوم کی شبانہ روز دعاؤں کے بعد ایک خوب صورت موقع دیا تھا امریکہ دلدل سے نکلنے کا مگر افسوس کہ ڈالروں کی چمک نے آنکھوں سے بصارت اور دلوں سے بصیرت زائل کر کے رکھ دی۔اقبال نے تو کہا تھا اور کتنا صحیح کہا تھا

؎ سبب کچھ اور ہے جس کو تو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری ہے نہیں

اقبال ہی نے فرمایا ہے

؎ پرواز ہے دونوں کی اس ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

چنانچہ ہمارے جامہ زیب۔دل فریب وزیراعظم یوسف رضا گیلانی ان دنوں ایک ہیجانی کیفیت میں ہیں۔شاہین صفت تو ہرگز نہیں معلوم ہوتے اور کرگس کہہ کر ہم توہین کر نہیں سکتے۔

اگرچہ وہ خود توہین عدالت کے مرتکب ہو کر سزا یافتہ وزیراعظم کا منفرد ایوارڈ بھی سینے پر سجا چکے ہیں اس کے باوجود ملکوں ملکوں دورے کرتے پھرتے ہیں۔روزانہ نئی سے نئی گل افشانی کرتے رہتے ہیں اور زبان حال سے عوام کو یہی بتاتے رہتے ہیں

؎ میں مسند عالی کو خالی نہ کروں گا

ان کے ارشادات عالیہ سے پہلے سپریم کورٹ کا تفصیلی فیصلہ ملاحظہ فرمایئے جو 9 مئی کے اخبارات کی زینت بنا ہے۔

''وزیراعظم گیلانی کی سزا کا ممکنہ نتیجہ 5 سال کے لیے نااہلی ہے۔اعلیٰ ترین عہدے دار حکم کا احترام نہیں کرے گا تو عدالتی نظام تباہ ہو جائے گا۔عدالت کا جان بوجھ کر مذاق اڑایا گیا۔اعتزاز احسن کی یہ دلیل نا قابل قبول ہے کہ اظہار وجوہ کا نوٹس دینے والا جج نااہل ہوتا ہے۔صدارتی استثنا کے معاملے پر دلیل مان لی جائے تو خطرناک روایت قائم ہو جائے گی: سپریم کورٹ''

جسٹس کھوسہ کے اضافی نوٹ کے اقتباسات

''☆ قابل رحم ہے وہ قوم جس کے رہنما قانون کی نافرمانی کر

کے شہادت کے متلاشی ہیں

☆ قابل رحم ہے وہ قوم جس کے حکمران قانون کا مذاق اڑاتے ہیں حالانکہ آخری کامیابی قانون ہی کی ہوتی ہے

☆ وہ قوم قابل رحم ہے جو اپنے کمزور کو تو سزا دیتی ہے مگر طاقتوروں کو کٹہرے میں لانے سے کتراتی ہے

ترس آتا ہے ایسی قوم پر جو مخصوص افراد کے لیے من پسند انصاف چاہتی ہے''

سپریم کورٹ سے چند سیکنڈ کی سزا پا کر سزا یافتہ ہو جانے والے وزیراعظم صاحب کے کان پر جوں تو کیا چیونٹی تک نہیں رینگی چنانچہ گاہے بگاہے یہاں وہاں گل افشانی گفتار فرماتے رہتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ملاحظہ فرمائیے:۔

''پاکستان میں توہین عدالت کا کوئی قانون نہیں

میں نے عدالت کی کوئی توہین نہیں کی یہ صرف آئین کی تشریح کا معاملہ ہے

میں پارٹی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے والوں میں سے نہیں ہوں

ہم کوئی نوکری پیشہ نہیں ہیں۔ ہم سیاستدان ہیں۔ گھر واپس جائیں گے'' وغیرہ وغیرہ

لندن میں سی این این کو انٹرویو بھی کمال کا دیا ہے۔ خاتون صحافی بیکی اینڈرسن اپنے بعض سوالوں کے عجیب وغریب جوابات پا کر حیران پریشان رہ گئی ہوگی ''یوٹیوب'' میں یہ انٹرویو موجود ہے۔ قارئین جسے دیکھ کر خاتون صحافی کے اضطراب کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک آدھ سوال جواب کی جھلکی ہم بھی دکھائے دیتے ہیں۔

بیکی اینڈرسن نے پوچھا ''آپ کو عدالت نے سزا سنائی۔ کسی اور ملک میں، کسی اور سیاستدان کے ساتھ ایسا ہوتا تو وہ اخلاقی طور پر مستعفی ہو جاتا۔ آپ مستعفی کیوں نہیں ہو رہے؟'' شاہ جی نے اپنی 'خوبصورت' انگریزی میں رکتے رکتے، سوچتے سوچتے، تھمتے تھمتے فرمایا ''میرے خیال میں میرا مؤقف ٹھیک ہے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت اور ہمارے حکومتی اتحادیوں کا بھی یہی خیال ہے کہ میں آئینی طور پر درست ہوں''

خاتون نے حوصلے سے جواب سنا اور پھر بولی ''میں اپنا سوال دھرا رہی ہوں۔ کیا آپ اخلاقی طور پر استعفیٰ دے دیں گے؟'' جواب میں شاہ جی بغلیں بھی جھانکتے رہے۔

خاتون نے پاکستان میں پھیلی کرپشن اور عوام کی روز افزوں بیزاری کے تناظر میں شاہ صاحب سے پوچھا ''آپ کو معلوم ہے کہ ان حالات کے باعث بیس فیصد پاکستانی ملک چھوڑ دینا چاہتے ہیں''

جواب میں ارشاد فرمایا ''تو پھر وہ ملک چھوڑ کر چلے کیوں نہیں جاتے؟۔ انہیں کون روک رہا ہے؟'' کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

؎ سزا یافتہ تو میں ہوں پر قوم کو
''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی''
دورے کرتے ہو کس دھڑلے سے
''شرم تم کو مگر نہیں آتی''

اور ہاں چلتے چلتے دو ایک اور ارشاد یوسفی ملاحظہ فرمائیے:۔

''گوزرداری گو'' سن سن کر بور ہو گیا تھا ''گو گیلانی گو'' سننے کی خواہش پوری ہو گئی۔ 9 سال تک ''گو مشرف گو'' ہوتا رہا مگر وہ اس وقت گیا جب اس کی مرضی تھی۔ ''میں نے کوئی مرغی نہیں چرائی'' صحافی کے سوال پر وزیراعظم کا قہقہہ

اے کاش!

؎ کاش کے تو نے مرغی ہی چرائی ہوتی
جگ میں پھر یوں نہ جگ ہنسائی ہوتی

''نئی دہلی: تیسری جماعت کی کتاب میں آزاد کشمیر لکھنے پر

راجیہ سبھا میں ہنگامہ۔ سی بی ایس ای کی جانب سے تیسری جماعت کی کتاب میں پاکستانی زیر انتظام کشمیر کے علاقے کو آزاد جموں کشمیر اور گلگت بلتستان کو پاکستان کا نادرن علاقہ قرار دینے پر بی جے پی ممبران نے راجیہ سبھا میں ہنگامہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اس ضمن میں کمیٹی کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے''

اسے کہتے ہیں حب الوطنی۔ اگر اتفاقاً کتاب میں صحیح اطلاع

درج ہو ہی گئی ہے تو ناجائز قابضین ہونے کے باوجود اتنا شور مچا رہے ہیں کہ اسمبلی میں ہنگامہ آرائی کر دی۔ ایک ہم بغض الوطنی کے ایسے مریض ہیں کہ اپنوں پر بڑے سے بڑا ظلم دیکھ کر بھی غیر کی ہاں میں ہاں ملائیں گے اور ڈومور یعنی کچھ اور۔ کچھ اور زیادہ کے مطالبے پر اقرار میں سر ہلاتے جائیں گے۔ اپنوں کو مجرم قرار دیتے جائیں گے۔ انہیں اٹھوا کر غیروں کے حوالے کر کے جیب ڈالروں سے بھرتے جائیں گے۔ اپنی سرزمین پر امریکی دہشت گردی کا مسئلہ ہو، یا حافظ سعید صاحب کے سر کی قیمت کا معاملہ ہو۔ یا کسی ہندو لڑکیوں کا برضا و رغبت قبول اسلام کا معاملہ ہو غرض کوئی بھی اہم قومی و مذہبی معاملہ ہو ہماری 'عاقل و بالغ' این جی اوز اور انہی کے ہمنوا ان کے بھائی بند غیروں کی طرف داری کرتے پائے جاتے ہیں۔ سیدھے سبھاؤ تو دین اسلام پر صاف صاف برا بھلا کہنے کی جرأت نہیں رکھتے کہ اپنا سر بھی انہیں عزیز ہوتا ہے البتہ ملا، مولوی وغیرہ کو بے نقط سنا کر دل کا غبار نکال لیتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ لوگوں سے تو یوں اوہلا کر لیا۔ ان کے غیض وغضب سے بچنے کا سامان کر لیا مگر دلوں کے بھید جاننے والی لطیف وخبیر وقدیر ذات سے کیسے بچ پائیں گے؟ بھارت کا پاکستان دشمنی میں ایک ہی مؤقف ہے۔ کیا حزب اقتدار کیا حزب اختلاف ہر دو بلکہ ہندو پاکستان دشمنی میں سرتاپا غرق ہے اور متفق و مسرور ہے، یہ فخر صرف ہمیں ہی حاصل ہے کہ ہم پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا، دونوں جگہوں پر پاکستان، نظریۂ پاکستان کے خلاف خوب بولتے ہیں اور اسلام کی تفسیر وتشریح من چاہے انداز میں یوں کرتے ہیں گویا قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کرنے میں ہم نے عمریں گزار دی ہوں

ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے
ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ

☆.....☆.....☆

''نواز شریف شارٹ مارچ نہیں کر سکتے۔ وزیراعظم وہی ہوگا جس پر ہاتھ رکھوں گا: وزیراعظم گیلانی''

ماشاء اللہ کیا خوش فہمیاں ہیں۔ کیوں نہ ہوں آخر ملتان کے گدی نشین ہیں۔ مرید ویسے ہی جھک جھک کے دماغ خراب کر دیتے ہیں یہاں تو مرشد پاک خیر سے وزیراعظم بھی ہیں۔ سزا یافتہ ہیں تو کیا ہوا۔ اس سزا میں بھی کیسی شان تھی۔ سپریم کورٹ نے بھی مرشد پاک کو لمبی چوڑی سزا نہیں دی۔ دے بھی کیسے سکتی تھی بھلا۔ محض چند سیکنڈ کی سزا بھی کوئی سزا ہوتی ہے۔ چوری تو وہ ہے جو لکھ کی کی جائے بھلا لکھ کی چوری بھی کوئی چوری ہوتی ہے۔ عوام اس بات کو سمجھتے ہی نہیں۔ موٹی عقل والے، موٹا گوشت کھانے والوں کی عقل بھی آخر موٹی ہوتی ہے۔ ایوان اقتدار کے نفیس کھانے یہ کھائیں تو انہیں سیاست کی نفاستوں اور باریکیوں کا علم ہو۔

ارے واہ! یوسف ثانی صاحب! آپ کا ہاتھ اتنا ہی کرامت و برکت والا ہے تو پھر سب سے پہلے اپنے ہی سر پر رکھ لیا ہوتا۔ آپ ایسی ہی ہما شخصیت ہیں تو آپ کے کئی دوست احباب کے سر اس ہاتھ کے شدت سے منتظر ہونگے۔ چلیئے دوستوں کو جانے دیجئے پہلے اپنے صاحبزادہ پر تو ہاتھ رکھیئے۔ ان کی گلو خلاصی کروایئے مقدمات سے۔ ویسے جواب نہیں آپ کی شیریں مقالی کا۔ آپ کے دماغ عالی کا۔ ویسے اندر سے تو آپ کو بخوبی معلوم ہوگا کہ آپ کتنے پانی میں ہیں اب

جیسے تمام ہو گیا روغن چراغ کا
یہ حال ہو گیا ہے ہمارے دماغ کا

☆.....☆.....☆

''پاکستانی سرزمین پر 'بندے ماترم' پر بھارتی نوعمر رقاصہ کا دلکش رقص۔ وزیراعظم حیرت سے یہ منظر دیکھتے رہے: سکاؤٹ تقریب کی جھلکیاں''

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ ابھی تو امن کی آشا کا آغاز ہے۔ ابھی تو پاکستان کا پسندیدہ ترین ملک بنا ہے بھارت۔ ظاہر ہے پھر اس کی ہر چیز، ہر ادا پسندیدہ ترین ٹھہرے گی۔ وزیراعظم بے چارے کتنے مجبور تھے کہ بس حیرت سے یہ منظر دیکھتے رہے۔ ہمارا خیال ہے خیالات میں املا کی غلطی ہو گئی ہے۔ لکھنا مسرت ہوگا لکھا حیرت گیا۔ وہ تو خیر گزری کہ یوسف ثانی صاحب خود بھی اٹھ کر رقاصہ

کے ہمقدم نہیں ہو گئے ورنہ ایسے شاندار مواقع پر کہاں ہوش رہتا ہے اقتدار کے نشے میں مدہوش حکمرانوں کو۔ خیر وزیراعظم کا حیرت سے منظر دیکھنے پر مرزا عاصی اختر کا ایک قطع ملاحظہ فرمائیے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ۔

ہم نے بھی آج دیکھی ہے رقاصہ کی حیا
روپ اس قدر دکھائی دیئے ہیں بہار کے
اب اس کے بعد اور کہیں کیا ہم اپنا حال
''حیراں کئے ہوئے ہیں دل بے قرار کے''

☆.....☆.....☆

''افغانستان: کتے کے کاٹنے سے امریکی فوجی ہلاک۔ امریکی محکمہ صحت کے مطابق 24 سالہ امریکی فوجی کو جنوری 2011ء میں باؤلے کتے نے کاٹ لیا تھا''

لیجئے اوباما صاحب! اب تو کچھ ہوش کی دوا کریں۔ طالبان تو طالبان، افغانستان کے کتے بھی امریکی فوجیوں کو پسند نہیں کرتے، پھر آپ کس آس پر یہاں ڈیرے ڈالے بیٹھے ہیں۔ فارغ وقت میں افغان تاریخ بھی پڑھ ڈالیئے اس قوم سے شناسائی ہو جائے گی۔ ویسے تو آپ کو بھی اندر سے لوگ چکی ہے تبھی تو ڈیرہ ڈنڈہ اٹھانے کیلئے پر تول رہے ہیں۔ مگر کوئی راستہ ملے تو تب نا۔ انشاءاللہ غالب کا یہ شعر آپ پر بھی صادق آئے گا:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے؛

☆.....☆.....☆

''بیوی کو سنبھال نہیں سکتے تو شادی کیوں کی۔ بھارتی ہائی کورٹ کی ایک خاوند کو سرزنش''

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح تو ہوتا ہے پھر اس طرح کے کاموں میں۔ یہ عورت ذات بھی ایسی ہے نیک ہو تو دنیا کی بہترین متاع اور اگر وکھری ٹائپ کی ہو تو پھر شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہو گا۔

ویسے یہ صرف اب بھارت کا معاملہ ہی نہیں رہے گا یہ وقت ہمارے ہاں بھی بس آیا ہے چاہتا ہے۔ این جی اوز کی مہربانی سے اور پارلیمنٹ میں آزاد خیال مرد و خواتین کی لن ترانی سے۔ ذرا وہ بل کو غور سے پڑھیئے جس میں خواتین کو خوش کرنے کے لیے نہ جانے کیا کیا کہا گیا ہے۔ اور جس کے بعد ہمارے ہاں کی وکھری ٹائپ وسٹائل کی خواتین کچھ زیادہ ہی منہ زور ہو جائیں گی اور شریف مرد کچھ اور کمزور۔ کیا خبر شریف شوہر کے لب پر مرزا عاصی اختر کا یہ قطع اکثر رہے۔

ہائے وہ شام سہانی میری
ساتھ میرے تھی زنانی میری
کب پولیس سنتی تھی کہانی میری
''اور پھر وہ بھی زبانی میری''

☆.....☆.....☆

مسکرایئے

صدقہ بھی فائدہ بھی

ابو ہریرہؓ روای ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کسی بھلے کام کو ہرگز معمولی نہ سمجھو خواہ اپنے بھائی سے خندہ و کشادہ روئی (یعنی مسکراتے چہرے سے) سے بات کرنا ہی کیوں نہ ہو۔ (بلوغ المرام) آپ ﷺ کی تعریف میں یہ بیان ہوا کہ آپ سب سے بڑھ کر مسکرانے والے تھے۔ آپ کی ذات سراپا رہنمائی ہے اور ہر سنت طیبہ میں ہمارے لیے بھلائی ہے۔ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس معمولی سے کام میں جہاں نہ کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی کچھ محنت مشقت ہوتی ہے بلکہ ہونٹوں کو ذرا سا پھیلانا ہی تو ہے تو صدقہ جیسے اعلیٰ عمل کا ثواب کیسے ملتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسکراتے چہرے کا سامنے والے پر کیا اثر پڑتا ہے.....؟ نیز خود مسکرانے والے پر اپنے مسکرانے کا کیا جادوئی اثر ہوتا ہے۔ انسان جب کسی سے ملاقات کرتا ہے یا کسی کی طرف دیکھتا ہے تو بھی سامنے والا متوجہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی کھلے مسکراتے چہرے سے اور خندہ پیشانی سے ملے تو سامنے والا مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور خود بخود اس کے دل میں مخاطب کے لیے اچھے اور مثبت جذبات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اگر تیوری پر بل چڑھا کر ملے تو جواباً سامنے والے کیلئے مسکرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ نیز مسکرانے سے غصے پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے اگر ہم کسی سے ملاقات کیلئے جائیں اور وہ مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کرے اور مسکراتے ہوئے ہی ہماری خاطر مدارت میں لگ جائے تو قدرتی طور پر ہم بار بار اس سے ملاقات کیلئے جائینگے لیکن کسی سپاٹ چہرے اور خشک رو انسان سے ملاقات ہو بھی جائے تو وہاں سے جلدی اٹھنے کو دل چاہتا ہے دوبارہ ملنا تو درکنار ہر وقت روتے منہ بسورتے چہروں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ ماں بھی اپنے ایسے بچے سے اکتا جاتی ہے جس کی عادت ہر وقت منہ بسورنا ہو۔

کون بہتے ہوئے اشکوں پہ نظر رکھتا ہے
لوگ ہنستے ہوئے چہروں کو دعا دیتے ہیں

سویڈن میں ہونے والی ایک تحقیق میں کچھ لوگوں کو چند گھنٹوں کیلئے چند تصویریں دی گئیں جن میں کچھ مسکراتی ہوئی اور کچھ غصے سے گھورتی ہوئی تھیں۔ پھر یہ نوٹ کیا گیا کہ لوگ مسکراتی تصاویر کو دیکھ کر خود بھی مسکرانے لگے اور گھورتی ہوئی تصاویر کو دیکھنے والے خود کو اداس اور پریشان محسوس کرنے لگے اور جب ان سے تصاویر کے برعکس ردعمل ظاہر کرنے کو کہا تھا تو انہیں دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

مسکرانے کے فوائد پر تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ چہرے کے تاثرات مسکرانے والے کے اندرونی جذبات کا اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ یہ مسکرانے والے کے موڈ پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے کہ چہرہ انسان کی اندورنی کیفیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ مسکراہٹ کے ساتھ اپنی شخصیت کو پرکشش بنانا ہی وہ راز ہے جس کو اب مندرجہ بالا حدیث جس میں بیان کیا گیا ہے چہرہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اگر تیوری پر بل چڑھے ہوں اور مسکراہٹ موجود نہ ہو تو کوئی اس کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ پھر جس ماحول میں مسکراہٹیں بکھری ہوں وہ ماحول پرسکون لگتا ہے۔ وہ گھرانا جہاں ہر کوئی دوسروں کو ہر لمحے مسکرانے کا

تحفہ دے گا اس گھرانے سے کتنا مختلف ہوگا۔ جہاں ہر کوئی بے زار بیٹھا ہو۔

مسکراہٹ آپس میں رابطہ قائم کرنے کا مضبوط ذریعہ ہے آپ کی شخصیت میں اچھائی کا عکس آپ کی مسکراہٹ کے ذریعے جھلکتا ہے۔ مسکراہٹ انسان کو زیادہ پرامید، متحرک اور مثبت انداز میں سوچنے والا بناتی ہے۔ مسکراہٹ اعتماد میں اضافے کا باعث بھی ہے۔ دوست بنانے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پرامید لوگ زیادہ صحت مند ہوتے ہیں۔

سویڈن میں ہونے والی تحقیق میں اس بات پر بھی تحقیق ہوئی کہ مسکرانے سے دوسروں کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جب کوئی مسکرا کر ہماری طرف دیکھتا ہے تو ہمیں جذباتی طور پر سکون حاصل ہوتا ہے۔ مسکراہٹ کے ساتھ جب کوئی ملے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں گرمجوشی سے خوش آمدید کہا گیا ہے۔ پریشانی سے گھرے انسان کو جب مسکراہٹ کا تحفہ بار بار دیا جائے تو وہ لمحہ بھر کو اپنی پریشانیوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ خود مسکرانے کا عمل مسلسل کرنے لگے تو وہ اپنے غم اور پریشانی پر قابو پا سکتا ہے۔

مسکراہٹ کی کوئی قیمت نہیں مگر یہ بہت کچھ دیتی ہے۔ جو اس کو پاتے ہیں وہ جذباتی طور پر سیر ہو جاتے ہیں یہ ایک لمحے میں واقع ہوتی ہے مگر اسکی یاد کبھی کبھی تو ہمیشہ رہتی ہے۔ مسکراہٹ تھکے ماندوں کیلئے سکون و آرام کا باعث ناامیدوں کیلئے امید کا دیا اور پریشانیوں کیلئے قدرت کا بہترین تریاق ہے۔ ایسی دولت جو خریدی نہیں جا سکتی، چرائی نہیں جا سکتی اور نہ ہی ادھار لی جاتی ہے۔ سچے دلوں سے سعید چہروں پر بکھرنے والی مسکراہٹ ایک عظیم نعمت ہے۔ یہ ان چہروں پر سجی رہتی ہے جو اپنے دامن میں چھوٹی چھوٹی نیکیاں جمع کرتے رہتے ہیں اور یقیناً بہترین قدردان یعنی رب شکوران نیکیوں کی بھی بہترین قدر کرے گا۔

تو آیئے دوسروں کو یہ تحفہ دینے سے پہلے اپنے سے قریب رہنے والوں سے اس کا آغاز کریں۔ اپنے والدین، بہن، بھائی اپنے شوہر اپنے بچوں اور ملازمین کو یہ تحفہ پیش کریں اور اپنے گھروں کی فضا کو بدل دیں۔ پھر دوستوں اور عامتہ الناس کو پیش کر کے معاشرہ کو بھی خوشی اور سکون کا گہوارہ بنا دیں کہ مسکرانا معمولی عمل تو ہے لیکن یہ سنت مطہرہ ہے اور اس کا کوئی مول نہیں۔

☆☆☆

گرمیوں کی چھٹیاں

والدین کی ذمہ داری میں اضافے کا وقت مگر بچوں کی شخصیت نکھارنے کا بہترین موقع

گرمیوں کی چھٹیاں بچوں کیلئے ایک دلکش زمانہ ہوتا ہے۔تھکا دینے والی بوجھل اور سخت جان پڑھائی کے مشکل سفر کے بعد بچوں کیلئے ان چھٹیوں کو سال کا سنہری وقفہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

بہت سے سکولوں میں پڑھائی کے سال کا اختتام چھٹیوں سے پہلے ہو جاتا ہے۔ بچے اُن چھٹیوں میں تفریح کے لمحات گزارنے کیلئے ذہنی طور پر تیار اور خوش ہوتے ہیں۔ان کے برعکس والدین بہت متفکر دکھائی دیتے ہیں کہ اتنی لمبی چھٹیوں میں بچے کہیں کوئی بری عادات نہ سیکھ لیں ان کیلئے مسائل نہ کھڑے ہو جائیں۔ ماں باپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اپنی اپنی مصروفیات کم کر کے بچوں کو زیادہ وقت دینے کے دن آ چکے ہیں۔

والدین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بچوں کی دلچسپی کے مطابق شیڈول تشکیل دیں تا کہ وہ خود بخود اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔والدین کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ بچے پرندوں کی مانند ہوتے ہیں۔ وہ ہر جگہ اور ہر موسم سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔انہیں کھیلنے اور سیکھنے کے جتنے زیادہ مواقع دیئے جائیں گے تو ان کا آئی کیو لیول اتنا ہی زیادہ بڑھے گا اور وہ زندگی میں بہت کچھ سیکھ پائیں گے۔اگر انہیں گھر کے اندر بند کر کے رکھا جائے گا تو وہ پر کٹے پرندوں کی مانند اپنی پرواز کھو دیں گے۔انہیں آزادی دیں مگر مناسب حد تک، اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ان کی سرگرمیوں میں شامل ہوں اور ان کے دوست بن کر رہیں۔انہیں بیکار بیٹھ کر سوچنے کی فرصت مت دیں۔ نئے نئے تجربے کرنے میں ان کی مدد کریں۔

نئی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر اکسائیں

یہاں ہم کچھ ایسی سرگرمیوں کا تذکرہ کر رہے ہیں جو بچوں کے لئے بے حد مفید بھی ثابت ہوں گی اور انہیں مصروف بھی رکھیں گی۔

نماز کی پابندی کروائیں

چھٹیوں میں بچوں کی نماز کی طرف خصوصی توجہ دیں۔لڑکے مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کریں اور لڑکیاں گھروں میں۔ بہت سی مائیں یہ سوال اٹھاتی ہیں کہ ہم کس کے ساتھ بچوں کو مسجد میں بھیجیں جبکہ گھر کا کوئی فرد مسجد میں نماز پڑھنے نہیں جاتا۔ مجھے ایک ماں نے بتایا کہ وہ خود اپنے بچے کو مسجد کے دروازے تک چھوڑ کر آتی ہے اور نماز ختم ہونے تک باہر کھڑی رہتی ہے۔بچوں کو صراط مستقیم پر چلانے کیلئے ماں باپ کو بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور بہت زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

قرآن سے جڑنا سکھائیں

بچوں کو بتائیں کہ ان چھٹیوں میں گزارا ہوا ہر لمحہ ہمیں نیکیاں مہیا کر سکتا ہے۔انہیں عربی اور قرآن کلاسز جوائن کرائیں یا پھر خود اپنے گھر میں ہر روز شام یا صبح کے وقت جب سب بچے اکٹھے ہوں ان کے محلے کے دوست یا عزیز و اقارب کے بچے بھی آ سکیں اس وقت قرآن کی چند آیات کا ترجمہ معہ تشریح پڑھ کر سنائیں۔کسی ایک بچے سے روزانہ پڑھوائیں تا کہ قرآن کے ترجمہ اور تشریح سے ان کی شناسائی ہو۔کوئی ایک حدیث یا تاریخی واقعہ بھی لازماً ساتھ سنائیں تا کہ دلچسپی برقرار رہے۔

گھر کے کام کاج

پڑھائی میں مصروف بچوں کو والدین کا ہاتھ بٹانے کا کم ہی موقع ملتا ہے۔والدین بچوں کو سکھائیں کہ گھر کو کیسے صاف رکھنا ہے۔

چیزوں کو درست طریقے سے کیسے رکھا جاتا ہے۔ گھر کو کیسے سجانا ہے، سبزی کیسے کاٹنی ہے، سادہ شوربہ یا چاول کیسے پکانے ہیں، ناشتہ کیسے بنانا ہے تاکہ والدین کی عدم موجودگی میں یا ان کی بیماری کی صورت میں وہ بخوبی یہ کام کرسکیں۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام سیکھیں جیسے بلب تبدیل کرنا، استری کا پلگ لگانا، فیوز لگانا، اپنی الماری کا گرا ہوا طاق خود سے جوڑ لینا، دروازوں سے ہینڈل لگانا، ٹینکی کی شاور بدلنا، اپنا کمرہ صاف کرنا وغیرہ۔

بچوں کو اپنی تہذیب وروایات سے روشناس کروائیں

یہ بہترین وقت ہے جب ہم بچوں کو اپنی روایات، اخلاق، تہذیب سے روشناس کرواسکتے ہیں۔ بچوں کو عادت ڈالیں کہ وہ گھر کے بزرگوں کے پاس بیٹھیں اوران کے ساتھ کچھ وقت گزاریں انہیں اپنے خاندان کے سچے، محنتی، ایماندار، اللہ والے بزرگوں کے سبق آموز، دلچسپ واقعات سنائیں تاکہ وہ اپنے خاندانی ورثے سے واقف ہوسکیں۔

بچوں کو کچھ مفید سوشل ورک کرنے دیں

ان چھٹیوں میں ہم اپنے بچوں کو سکھا سکتے ہیں کہ وہ کسی بھی ان پڑھ کو پڑھا کر اپنے وقت کا بہترین استعمال سیکھیں۔ اپنے محلے کے کسی بچے یا ملازم کو لکھنا پڑھنا سکھائیں، باغبانی کرنا، اپنے محلے کے سب گھروں میں ایک ایک پودا لگانا، ان کی نگہداشت کرنا، کسی بھی جانور پالتو کے طور پر پالنا جیسے بلی، مرغی، خرگوش، بطخ، طوطا، بٹیر، کبوتر وغیرہ۔ جانوروں اور پودوں کی نگہداشت کرنے سے بچوں میں ذمہ داری کی عادت پختہ ہوتی ہے اور فطرت سے لگاؤ پروان چڑھتا ہے۔ ٹین ایجز بچے اپنے محلے کی صفائی کا بھی مل جل کر اہتمام کرسکتے ہیں۔ اگر مواقع میسر ہوں تو کسی بھی ادارے میں جاکر رفاع عامہ کیلئے کام کریں۔ کسی اچھی شہرت کی حامل این جی او کے ساتھ مل کر بھی کام کیا جاسکتا ہے۔

کہانیاں پڑھنا اور لکھنا

کہانی پڑھنا بچے کے تخیل کو زرخیز بناتا ہے اور اسے وسعت دیتا ہے۔ سکول کی پڑھائی کے دوران کہانیاں پڑھنے کے بہت کم مواقع ملتے ہیں۔ بچوں میں کتب بینی کا شوق پیدا کریں۔ خوبصورت کہانیوں کی کتابیں لاکر دیں، کہانیوں کے انتخاب میں بچوں کی مدد کریں۔ اسلامی وتاریخی داستانیں، اللہ اور پیارے نبیؐ سے محبت کی کہانیاں، سچے واقعات، بہادروں کے قصے ایسے واقعات جو بچوں کو کچھ کرگزرنے پر مجبور کردیں اور خود سے لکھنے کا جذبہ پیدا ہوجائے۔

انگریزی سیکھیں

آج کے دور میں کمیونیکیشن کا مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے، بچوں کی انگریزی درست کروانے کیلئے انہیں انگلش کلاسز جوائن کروائیں کیونکہ ہمارے ملک کے تعلیمی نظام میں انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرنا ازحد ضروری ہے۔ گھر میں انگریزی اخبار لگوائیں۔ انہیں انگریزی ادب سے روشناس کروائیں۔ مگر کوئی بھی کتاب بچے کے ہاتھ میں دینے سے پہلے خود ضرور پڑھ لیں۔

سیر وتفریح

تاریخی مقامات اور مساجد کی سیر سے بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ کچھ بچوں کو گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ بہت سے سکول ان چھٹیوں میں بچوں کو تعلیمی ٹورز پر لے کر جاتے ہیں۔ جو عموماً تین سے چار دن پر محیط ہوتے ہیں۔ ان ٹورز سے بچوں کو اپنے ملک کی تہذیب، ثقافت، مختلف لوگوں کے رہن سہن، ان کی زبان اور طور طریقوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اکٹھے سفر کرنے سے بچوں میں باہمی میل جول کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں سوچنے اور ہمدردی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے سے چیزوں کو بانٹنے کی عادت پڑتی ہے جو بچے مل جل کر نہیں رہتے عملی زندگی میں وہ خودغرض ہوجاتے ہیں۔

فطرت کے قریب رہنے کا موقع دیں

ان چھٹیوں میں بچوں کو فطرت کے قریب رہنے کا موقع فراہم کیجئے۔ اگر کسی کے عزیز واقارب گاؤں یا پہاڑی علاقوں میں رہتے

ہیں تو بچوں کو ضرور چند دنوں کیلئے وہاں لے کر جائیں۔ انہیں مواقع دیجئے جیسے درختوں پر چڑھنا، جھیلوں میں تیرنا، تنکوں کے گھر بنانا، اگر سمندر کے قریب ہیں تو ریت کے گھر بنانا وغیرہ۔ فطرت کے قریب ہونے سے بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں جیسے دریا کیسا ہوتا ہے، اس کا پانی کہاں جاتا ہے، فصلیں کیسے اگتی ہیں۔ گندم درخت پر لگی ہے یا زمین سے نکلتی ہے۔ چڑیا گھر میں جانوروں کو دیکھنے، باغوں میں پھولوں اور پودوں کے حسن سے لطف اندوز ہونے سے غور وفکر کی عادت پڑتی ہے۔ رات کو ستاروں بھرا آسمان دکھائیں۔ انہیں بتائیں سب سے روشن ستارہ کون سا ہے۔ کہکشاں کیسے بنتی ہے۔ رات کو صحن میں سونے والے بچے ان ستاروں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں مگر گھر کے اندر سونے والے بچے اس لطف سے محروم ہیں۔

تیراکی

تیراکی ایک بہترین مشغلہ ہے جسے بچے چھٹیوں میں اپنا سکتے ہیں۔ ہر بچہ تیراکی کا شوقین ہوتا ہے اور اسے تیراکی میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ تیراکی کیلئے اچھے کوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں تیراکی کیلئے کلب اور اچھے کوچنگ سنٹر بنے ہوتے ہیں۔ جہاں پر بچوں کو لے جا کر سوئمنگ سکھائی جاسکتی ہے۔ اگر بچے تیراکی سیکھ لیتے ہیں تو وہ اپنے سکول میں سوئمنگ گالا میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ بہترین ورزش ہے جس سے بچے کی جسمانی صحت برقرار رہتی ہے۔ بہت تیراکی کرنے والے بچے مشکل مواقع پر بہت کم گھبراہٹ کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اعصاب پر قابو رکھنا سیکھ لیتے ہیں جس سے ان کی نفسیات اور دماغی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے اور مستقبل میں صحت مند طرز زندگی اپناتے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

بچوں کی دلچسپی کے کھیلوں میں ان کی رہنمائی کریں

آج کل چھوٹے بچے کرکٹ کے بے حد شوقین دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے کھلاڑیوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جیسے عمران خان، وسیم اکرم، شاہد آفریدی، یونس خان وغیرہ۔ وہ ان کی طرح کھیلنا اور دکھانا چاہتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو تلاش کریں تاکہ وہ پڑھائی کے علاوہ دوسری سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینا سیکھیں اور زندگی کو بھرپور طریقے سے جی سکیں۔ والدین کو چاہئے کہ بچوں کو کھیلوں کے سمر کیمپ جوائن کروائیں اور وہ کھیلوں میں اپنی بھرپور توانائیاں استعمال کر سکیں۔ نئی کالونیوں میں جگہ جگہ پارکس بنے ہوتے ہیں ان کے ساتھ کہیں کہیں سپورٹس کلب بھی مل جاتے ہیں۔ اگر سپورٹس کلب جوائن نہیں کروا سکتے تو پارکس میں بغیر کسی فیس کے بچے کھیل کود سکتے ہیں۔

فنون لطیفہ

مصوری، خطاطی، گانا، موسیقی، اداکاری، رقص، فن تعمیر۔ یہ سبھی فنون لطیفہ کے تحت آتے ہیں۔ بہت سے بچے ان میں سے کچھ نہ کچھ پسند کرتے ہیں۔ کچھ سکولوں میں سمر کیمپ لگتے ہیں جن میں ان میں سے کچھ نہ کچھ سکھایا جاتا ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی درست سمت میں رہنمائی کریں۔ اگر کسی بچے کو گانے کا شوق ہے تو اس شوق کو حمد، نعت، ملی ترانے اور معروف شعراء کی نظموں اور غزلوں کو لحن سے سکھا کر ان کا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ مصوری میں قدرتی حسن کو سکیچ کریں۔ جن چیزوں کی ہمارے دین میں گنجائش نہیں وہ ان کے سامنے ضرور واضح کریں۔ خطاطی، مصوری ایسے فنون ہیں جن سے بچے کے اندر صبر توجہ، ذہنی یکسوئی، مثبت سوچ اور تخلیقی قوت بڑھتی ہے۔ ناچنے کے شوقین بچوں کو ایروبکس کروائی جائیں۔ ایکٹنگ سے بچوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ملتا ہے جس سے ان کے اندر کی جھجک دور ہوتی ہے اور ان میں خود اعتمادی آتی ہے۔

شارٹ کورسز

آج کل ہر چھوٹے بڑے شہر میں شارٹ کورسز کروائے جا رہے ہیں۔ جن میں مختلف ہنر، کھیل اور کمپیوٹر کے کورسز شامل ہیں، لڑکیوں کے لئے خصوصی نٹنگ اور میک اپ کلاسز بھی بہت عام ہیں۔ ان سے استفادہ کرنا بھی چھٹیوں کا اچھا استعمال ہے۔

سمر کیمپ

جو والدین دونوں ملازمت کرتے ہیں ان کے لئے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ وہ بچوں کو ان چھٹیوں میں کہاں چھوڑیں۔ آج کل بہت سے سکولوں میں سمر کیمپ لگائے جاتے ہیں جن سے ان والدین کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ ان دنوں میں بچوں کو مختلف کھیل کھلائے جاتے ہیں۔ ڈرائنگ، پینٹنگ ہینڈ ورک وغیرہ بچے بہت شوق سے کرتے ہیں۔

گرمیوں کی دوپہروں میں ان ڈور گیم

گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ سے بچوں کو بچانے کیلئے گھر کے اندر ان ڈور گیمز کا اہتمام کیجئے۔ بیت بازی، کوئنز پروگرام، لڈو، کیرم، اونو، میوزیکل چیئر بہترین مصروفیات ہیں۔ ہمسایوں کے بچوں اور عزیز و اقارب کے بچوں کو بلا کر فن فیئر منائیں یا پارٹی رکھیں جس میں سب بچے کچھ نہ کچھ عملی طور پر حصہ لیں۔ کوئی بھی دن منائیں اور اس میں معلوماتی پروگرام رکھیں جیسے میلاد النبیؐ، یوم پاکستان۔ گڈے گڈی کی شادی بھی رچائی جا سکتی ہے۔

دوسرے شہروں یا بیرون ملک چھٹیاں گزارنا

ہوشربا مہنگائی کے دور میں پاکستان کے دس فیصد لوگ پہاڑی مقامات یا سمندر کی سیر کیلئے جاتے ہیں۔ پانچ فیصد لوگ بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ پہاڑی مقامات کی ایک یا دو ہفتے کی سیر بچوں کو پورا سال ہشاش بشاش رکھتی ہے۔

ان تجاویز پر عمل کر کے آپ محسوس کریں گے کہ گرمیوں کی چھٹیاں پر لطف طریقے سے گزاری جا سکتی ہیں۔ یہ بچوں کیلئے بہت خوشی کا وقت ہوتا ہے۔ باقائدہ منصوبہ بندی سے اس وقت کو بہترین خوشگوار لمحوں میں بدلا جا سکتا ہے۔ والدین کو چاہئے کہ وہ باقاعدہ ایک شیڈول بنا لیں تاکہ بچے وقت برباد کرنے سے بچ جائیں اور ان چھٹیوں سے فائدہ مند اور کارآمد نتائج حاصل کیے جا سکیں۔ اگر والدین تھوڑی سی محنت سے اپنے بنائے ہوئے ٹائم ٹیبل پر عمل کروا سکیں تو وہ بچوں کے رویوں میں خوشگوار تبدیلی محسوس کریں گے اور انہیں مستقبل میں بہترین اولاد اور مفید شہری پائیں گے۔ انشاءاللہ

☆.....☆.....☆

رفتید، ولے نہ از دل ما

ان کی محبت یاد آتی ہے تو اشکوں کی برسات رکتی نہیں.....ساس کا تذکرہ ایک بہو کے قلم سے

آج کتنے دن اور ہفتے گزر گئے ہیں امی ابو کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ اپنے ہاتھوں سے آخری غسل دینے اور اپنی آنکھوں سے رخصتی کا منظر دیکھنے کے باوجود نہ ذہن مان رہا ہے نہ دل تسلیم کر رہا ہے حالانکہ یہ سب کچھ یقین کے ساتھ گزرا ہے۔

دراصل مائیں رخصت ہو جاتی ہیں تاکہ وہ اپنی اولادوں کا استقبال کر سکیں۔ بس یہی تصور خوش کن ہے کہ ہمارا استقبال کرنے کو والدین روانہ ہو گئے ہیں، عنقریب ملاقات ہو جائے گی پھر ملن کی ایسی سہانی صبح و شام ہوں گی جس میں فرقت و جدائی کا نہ خوف ہو گا نہ غم انشاء اللہ۔ میری امی مسعودہ بیگم جن سے میرا ساس بہو کا رشتہ تھا مگر درحقیقت ہمارے درمیان اللہ کے لئے محبت کا رشتہ تھا، اسی رشتے کی بدولت ہمارے درمیان دوستی بہت زیادہ تھی۔ شعر و شاعری اردو، فارسی، قرآن پاک و سیرت کے حوالے سے علمی و ادبی گفتگو ان کی پہچان تھی۔ ان کی خوبیاں کیا بیان کی جائیں۔ اگر میں اپنی ساس کے لئے کچھ کہوں تو وہ یہ ہے کہ میری نظر میں ''وہ دنیا کی بہترین ساس شمار کی جاتی ہیں۔''

وہ میری امی جان تھیں۔ میں نے ''امی'' کہہ کر مخاطب ان کو ہی کیا، اپنی والدہ کو ہم آپا جان کہتے تھے۔ امی جان اس ناچیز کی بہت قدردان تھیں۔ ان کا ہر اس فرد سے قدردانی کا رشتہ تھا جو قرآن پاک اور تحریک سے والہانہ وابستگی رکھتا ہو۔ قرآن پاک سے دلی تعلق اور تحریک سے وابستگی ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔

آخری عمر میں بھی قرآن پاک کے کسی نہ کسی حصہ کو یاد کرنے کی کوشش میں مصروف رہتیں۔ یہ سعادت صرف خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔ ہم نے کئی حج بہت سے عمرے اور طواف ایک ساتھ کئے۔ تفریحی سفر بھی ساتھ کئے۔ تحریکی سفر بھی کئے، چھوٹے سفر اور طویل سفر میں ہمارا ساتھ رہا۔ دوران سفر الحمدللہ ہمارے درمیان کبھی ایک بار بھی کسی معاملے میں باہم رنجش نارضگی کا موقع نہیں آیا۔ اس میں سارا کمال ان کی طبیعت، چاہت، خلوص اور قدردانی کا تھا۔ ہماری طرف سے جیسی بھی اور جو کچھ خدمت ہوتی اس کو بہت سراہتیں۔ واپس جا کر لوگوں سے کہتیں کہ ''نوریہ کی امی نے میرا اتنا خیال رکھا جیسے مائیں بچوں کا خیال کرتی ہیں''

بھلا کبھی ماں جیسا خیال بچے رکھ سکتے ہیں؟ یہ ان کی محبت تھی جو مجھے عزت دیتی تھیں۔ اسی طرح ہمارے دونوں والدین کے درمیان اتنی محبت، خلوص اور چاہت کا رشتہ تھا کہ دونوں طرف کے والدین کے درمیان کبھی ایک نقطہ بھی ناگواری کے ساتھ تبادلہ نہ ہوا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی تحریک سے وابستگی اور دونوں طرف کی وسیع القلبی اور اعلیٰ ظرفی تھی۔

فارسی سے شغف رکھتی تھیں۔ شعر یاد رکھنے اور برمحل اس کو ادا کرنے کا ان کو خوب ملکہ تھا۔ خوش مزاج، نرم دل تھیں۔ دوسروں کی تکلیف کو شدت سے محسوس کرتی تھیں۔ کتابوں کے بارے میں بہت حساس تھیں۔ ہر اچھی کتاب خرید کر دوسروں کو تحفہ دیتیں۔ اچھے شعر، نظمیں اپنی ڈائری میں لکھ رکھتیں۔ بڑی بڑی نظمیں یاد تھیں۔ آخری دنوں میں بھی نظمیں یاد کیں اور بچوں کو یاد کروائیں۔ دوسروں کے خطوط محفوظ رکھتیں۔ میرے دو تین خط تو انہوں نے پلاسٹک کور کروا کر محفوظ کئے ہوئے تھے اور سفر و حضر میں کتابوں میں سے چیدہ پیراگراف، پمفلٹس ساتھ رکھتیں۔ جہاں موقع ملتا پڑھ کر سناتیں۔

دوسروں کو تعلیم دینے کا جنون تھا۔ بے شمار لوگ ان سے تعلیم

دنیا میں بہت کم ساسیں ایسی ہوں گی جو اپنی بہو کا ساتھ دیتی ہوں بیٹے کے معاملے میں۔ وہ اپنے بیٹوں کو سرزنش کرنے میں کبھی نہ جھجکتی تھیں۔

حاصل کر کے گئے۔ گھر کی ماسیوں ان کے بچوں کے ساتھ بھی محنت کرتی رہتیں کہ کسی طرح پڑھ لکھ جائیں۔

اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت بے پناہ تھی۔ اس معاملے میں رقیق القلب اتنی زیادہ تھیں کہ بس نام لیتے ہی آواز بھرا جاتی۔ حرمین شریفین کے ساتھ ان کی روحانی وابستگی مثالی تھی۔ ہم دونوں کے مزاج، علم و ادب، قرآن پاک بیت اللہ و مسجد نبویؐ، جماعت اسلامی کے حوالے سے ایک جیسے تھے۔ گھنٹوں ہم مختلف موضوعات پر باتیں کرتے۔ کتابوں، شعروں، کہانیوں پہ تبصرے کرتے اور اس شوق کی بدولت ہمارے درمیان قلبی تعلق بڑھتا ہی رہا اور دوسرے، تیسرے کی برائیاں یا کسی کے خلاف کوئی چارج شیٹ کرنے کی نوبت نہ آتی۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی ہم کوئی ایسا فرد زیر بحث لائے ہوں جو متنازعہ ہو یا جس کی بڑائی کرنا مقصود ہو یا میں نے کسی کو ان کی نظروں میں گرانے کے لئے کچھ کیا ہو الحمد اللہ علی ذالک۔

وہ اپنی تحریکی ہونے اور اپنا رشتہ ہونے کا قصہ ضرور دہراتی رہتی تھیں۔ اس میں بھی ان کا کردار بہت قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنے سوتیلے بچوں اور ان کے بچوں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ رکھا اور اس بات کی گواہی وہ سب خود دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہر عمل کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین۔ ان کی شادی خالصتاً تحریکی بنیاد پر انجام پائی تھی اور انہوں نے اپنی ساری اولاد کی شادیاں اسی بنیاد پر کیں۔ تحریک کا وہ ایک بنیادی ستون تھیں۔ ''سابقون الاولون'' میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ملتان اور نواحی شہروں، قصبات میں ان کی جانفشانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان علاقوں میں تحریکی بیج ان کے ہاتھوں سے لگائے گئے ہیں اور ہر گزرتا وقت ان کی کوششوں کو بارآور کر رہا ہے۔ گویا ایک صدقہ جاریہ ہے جس کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور فزوں تر ہوتا جا رہا ہے۔ ''عائشہ پبلک سکول'' کے لئے فنڈ مہیا کرنے کے لئے ان کی کوششوں کو سراہنے کے لئے میرے پاس کوئی الفاظ نہیں ہیں۔

اس عظیم کام کا اجر عظیم وہ رب عظیم ہی دے سکتا ہے۔ اپنی اولادوں کے ساتھ بھی رشتہ دین سے تعلق کی بنا پر کم یا زیادہ تھا۔ بحیثیت ماں کے تو ساری اولادیں برابر ہوتی ہیں مگر وہ دین داری کا پیمانہ سامنے رکھنا کبھی نہ بھولتیں۔

واقعی ان کی خوشی اور ناراضگی کا پیمانہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وابستہ تھا۔ میں کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ وہ بعض معاملات میں اور اکثر اوقات اپنے بیٹے کی نسبت اپنی بہو سے زیادہ تعلق اور محبت کا اظہار کرتی تھیں۔ دنیا میں بہت کم ساسیں ایسی ہوں گی جو اپنی بہو کا ساتھ دیتی ہوں بیٹے کے معاملے میں۔ وہ اپنے بیٹوں کو سرزنش کرنے میں کبھی نہ جھجکتی تھیں۔ حق بات اور فرائض کی ادائیگی میں ان کا ساتھ واضح ہوتا تھا۔ مجھے نصیحت کرتیں کہ ''شوہر کے ساتھ زیادہ نرمی کریں تو وہ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں'' میرے سامنے، میرے شوہر اپنے بیٹے کو ایسے شعر سناتی رہتیں جس میں بیوی کی خوبیوں کا اور قدر کرنے کا اظہار ہوتا۔

ان سے اکثر کہتیں ''افسوس کہ تم نے قدر نہ جانی'' مجھے جب میاں کی شکایت کرنا ہوتی تو امی جان سے کہتی ان کو وہی شعر سنائیں تاکہ ان کو ہماری قدر کا احساس ہو۔ اصرار کر کے مجھے ''حال دل'' سنانے کہ کہتیں اور پھر میرے شوہر ماں سے گلہ کرتے اور بہت حیران ہوتے۔ کہتے:

''یہ دنیا کی عجیب ترین ساس بہو ہیں جو دونوں مل کر میرے خلاف ہو جاتی ہیں'' اب پشت پناہی کو کسے تلاش کریں؟ اب دعائیں کون کرے؟ کہاں سے لائیں وہ قیمتی دعائیں۔ کوئی محرومی سے محرومی ہے اب کس سے مان رکھیں؟ بیٹے سے برملا کہتیں کہ اگر تم نے بیوی کو تکلیف دی تو میں تم سے سخت ناراض ہوں۔ ان کی محبت یاد آتی ہے تو اشکوں کی برسات رکتی نہیں۔ اللہ ان کو اپنی محبت سے نوازے۔ آمین

ان کا توکل علی اللہ، سادگی، بے نیازی دنیا سے.....ایسی تھی کہ

حیرانی ہوتی تھی۔ ہر وقت تحریکی سفر کے لئے تیار رہتیں۔ دو جوڑے کپڑے، چند دکتابیں، چند اور ضروری چیزیں.....کتنی آسان زندگی تھی! رخصت ہوگئیں تو کوئی قابل ذکر شے نہ تھی ان کے سامان میں سوائے کتابوں کے۔ دوسروں کی ہر طرح سے مدد کرتیں۔ دوسروں کے دکھ تکلیف کو اپنا جان کر اس کا مداوا کرنے کی کوشش کرتیں۔

ابا جان میرے سسر خواجہ عبدالاحد صدیقی ان سے کچھ عرصہ پہلے داغ مفارقت دے گئے تھے۔ وہ بھی اپنے خاندان کے واحد فرد تھے جن کی سادگی، خلوص، ایمانداری، دیانتداری اور اپنے مقصد سے لگن کی مثال دینا مشکل ہے۔ وہ اپنے خاندان کے ولی اللہ تھے۔ سیدھی صاف ستھری زندگی گزارنے والے جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ تعیّشات سے کوسوں دور رہنے والے، حق بات پر ڈٹ جانے والے، دوسروں سے خدمت نہ لینے والے۔ اپنے ذاتی کام خود ہی انجام دیتے کسی کو تکلیف نہ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت ان کے ہر عمل سے محسوس ہوتی تھی۔

امی جان کے بارے میں یقین نہیں آتا کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ابا جان کو تو میں نے آخری لمحات میں دیکھا ہی نہیں اس لیے کوئی تصور بھی نہیں بن پاتا کہ وہ اب یہاں نہیں ہیں۔ کل من علیھا فان و یبقی وجہ ایک ذی الجلال والاکرام۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت کے اس اعلیٰ درجے میں رکھے جہاں انبیا، صدیقین اور شہداء اور صالحین رہتے ہیں اور ہمیں ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

بتول میگزین

دست بستہ معافی!

(نورین صدیقی۔کراچی)

میرے چارہ گر کو نوید ہو، صف دشمناں کو خبر کرو کہ ہم بیدار ہو گئے ہیں۔

جی ہاں ہم بیدار ہو گئے ہیں اور ہم نے کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ حالانکہ اس حوالے سے ہمارا سابقہ ریکارڈ خاصا خراب ہے۔ یہ ریکارڈ خراب ہونے کی بات سن کر آپ ہماری طرف مشکوک نظروں سے نہ دیکھیں ہم دراصل کہنا چاہتے ہیں کہ ماضی قریب اور ماضی بعید دونوں میں ہماری ذمہ داران کو اس حوالے سے ہم سے خاصی شکایات رہی ہیں وہ بے چاری قلم کے مثبت استعمال کی طرف مسلسل راغب کرتی رہتیں اور ہم ''جی انشاء اللہ کوشش کرینگے'' کا راگ الاپتے رہتے لیکن ہمارا یہ وعدہ ''وعدہ محبوب'' کی طرح ذرا کم ہی پورا ہوا۔ دراصل ہم یہ تو نہیں جانتے کہ ہم میں لکھنے کے جراثیم ہیں یا نہیں لیکن یہ ضرور جانتے ہیں کہ لکھنے کے ہمیشہ سے چور رہے ہیں۔ اگر کبھی مر مار کے کچھ لکھ بھی لیا تو اس کو فیئر کر کے پوسٹ کرنے سے تو ہماری جان جاتی تھی۔ ہماری بے چاری ساتھی اس کا یہ حال بتاتیں کہ پیاری بہن آپ صرف لکھ لیا کریں فیئر ہم کسی اور سے کرالیں گے۔ لیکن یہ بات تو ہم جانتے ہیں کہ ہماری شاہکار لکھائی پڑھنا کسی کے بس کی بات ذرا کم ہی تھی سو یہ دلیل بھی منڈھے نہ چڑھی! لیکن آج جب اپنے ماشاءاللہ پانچ عدد بچوں کیلئے وقتاً فوقتاً تقریریں لکھنی پڑتی ہیں اس حوالے سے بعض اوقات ایسے ایسے الٹے کام کرنے پڑتے ہیں کہ یقین ہو چلا ہے کہ یہ ہمیں ان بہنوں کو تنگ کرنے کی ہی سزا ملی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی کچھ یوں ہے کہ ہمارے اکلوتے ولی عہد جو کہ کلاس ششم میں پڑھتے ہیں بڑے اچھے لحن و انداز سے اشعار پڑھتے ہیں۔ ان کے سکول میں الیکشن تھے۔ سکول سے آ کر بولے مما فٹ بال گروپ نے کہا ہے کہ الیکشن کمپین کیلئے دو تین شعر یاد کر کے آنا۔ پہلے تو ہمیں بہت غصہ آیا کہ فٹ بال جیسی انتہائی غیر رومانٹک چیز پر اشعار کیسے مل سکتے ہیں۔ لیکن صاحبزادے کی خواہش تھی سو کتابیں کھنگالیں، پروفیسر عنایت علی خان کی عنایات کام آئی اور ہم نے اس میں سے ان کی ایک نظم ''جب تیری بزم میں سب مہر بہ لب ہوتے ہیں'' کی پیروڈی کر کے فٹ بال پر نظم بنا دی۔ صاحبزادے اگلے دن بڑے خوش خوش سکول سے واپس آئے اور بولے۔ مما سب بچوں نے خواب واہ واہ کی پلیز اب راکٹ والوں نے کہا ہے کہ راکٹ پر کوئی شعر یاد کر کے آنا

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

سو اس تمام صورتحال میں ہم نے یہی سوچا کہ اپنی تمام موجودہ اور سابقہ ذمہ داران سے دست بدستہ معافی مانگیں تا کہ ہمیں فٹ بالوں اور راکٹوں پر طبع آزمائی سے نجات ملے..... (اس معذرت نامے کیلئے ہم نے بتول کا سہارا اس لیے لیا کیونکہ اپنی بیشتر ساتھیوں کی خیر خبر ہمیں بتول میں ان کی تحاریر پڑھ کر ہی ملتی ہے)۔

نعتیہ کلام

(محمد رضا تیمور۔بوریوالا)

ہماری والدہ محترمہ کچھ عرصہ قبل ہم سے جدا ہو گئیں۔ بے شک سب کی منزل یہی ہے لیکن مختصر سی زندگی میں بہر حال ان کی کمی محسوس

ہوتی رہے گی۔ میری نانی محترم بھی اپنے انداز میں شعر کہا کرتی تھیں۔ اسی طرح والدہ محترمہ بھی کبھی کچھ اشعار لکھوا دیتی تھیں۔ ان کی کہی پنجابی نعتیں میرے پاس محفوظ ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔

میرے اللہ دے حبیب مینوں رکھ لو قریب
گل مک دی مکاواں تاڈے روزے اتے آواں
ہار پھلاں دے لیاواں
روزہ بڑی دور تیرا آنا مجبور میرا
دسے جا کے تانوں کیہڑا
میں آواں گی ضروری جے کر ہوئی منظوری
آواں ندیاں میں چیر
میرے اللہ دے حبیب
میریاں خواباں وچ آ کے مینوں ستیاں جگا کے
کر گئے دلگیر
میرے اللہ دے حبیب

مرحومہ ہدایت بی بی (ام زیب وسعدیہ)

متاع حیات

(ربیعہ ندرت۔ لاہور)

کل ہی میں نے کسی سے سنا کہ تمہارا انتقال ہو گیا ہے لمحہ بھر کیلئے میں سکتہ میں آ گئی۔ آنکھوں کے سامنے تمہارا سراپا گھوم گیا۔ شاہانہ لباس، بیش قیمت ہیروں اور جواہرات سے مزین زیورات پہنے ہوئے ہلکے سے میک اپ اور دلکش مسکراہٹ سے سجا ہوا چہرہ، گفتگو ایسی گویا جھرنا بہہ رہا ہو۔ بادنسیم کی سی چال، محفلوں کی جان، تمہاری زندگی سالہا سال سے یونہی اپنی پٹری پر رواں دواں تھی کہ چلتے چلتے دوران سفر اچانک تمہارا اسٹیشن آ گیا اور تم چپکے سے ٹرین سے اتر گئیں۔ کیا موت تمہارے لیے بھی تھی.....؟

مجھے یاد ہے کہ محفل میں دوران گفتگو اگر تمہارا کسی سے کوئی اختلاف ہو جاتا تھا تو تم مخاطب کو اپنی پر اثر باتوں اور دلائل سے بہت جلدی قائل کر لیتیں اور مخالف جھکنے پر مجبور ہو جاتا لیکن اس دفعہ تم نے موت سے بے چون و چرا ہار مان لی۔ میں نے سنا ہے کہ جب موت دبائے پاؤں چلتی ہوئی تمہارے قریب آئی اور اور اس نے تمہارے کان میں سرگوشی کی تو تم نے اسی وقت اپنے آس پاس کھڑے ہوئے بے چین اور مضطرب عزیز و اقارب سے نظریں پھر لیں۔ خلاف معمول تم نے موت کی پکار کے جواب میں انکار کیا۔ نہ اصرار، نہ تکرار بلکہ لبیک کہتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

تم تو ہمہ وقت اپنے دوست احباب اور ہم جولیوں میں گھری رہتی تھیں۔ اب تن تنہا کس منزل کی جانب روانہ ہو گئیں۔ تم مٹی اور گرد و غبار سے ہمیشہ نالاں رہیں لیکن بالآخر مٹی ہی کی چادر اوڑھ کر سو گئیں۔ تم محفلوں کی رونق تھیں پھر شہر خموشاں جا کر کیونکر آباد ہو گئیں۔ تمہارے خیالات اور افکار پہاڑوں کی مانند بلند و بالا تھے لیکن تمہارا جسد خاکی زمین کی گہرائیوں میں چھپ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ گرمی کے موسم میں جب کبھی تم بیرون ملک کچھ عرصہ گزار کر واپس آتیں تو ہم سب کو وہاں کے حسین و رنگین واقعات خوب مزے لے لے کر سنایا کرتی تھیں۔ اب تمہارے اس سفر کی داستان ہم کو کون سنائے گا!

میں سوچتی ہوں کہ تم نے اپنے اس سامان کو جو تم نے بہت محنت محبت اور شوق سے اکٹھا کیا تھا اسے چھوڑ کر خالی ہاتھ چلدیں۔ تمہیں اپنی ہر چیز پر فخر تھا اور فخر کیوں نہ ہوتا! ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک یگانہ قیمتی اور خوبصورت جو تھی۔ تم اپنی ان چیزوں کا حد سے بڑھ کر خیال رکھتی تھیں۔ مبادا خراب ہو جائے، ٹوٹ جائے، کہیں کھو جائے، تمہارے جانے کے بعد تمہارا وہ سب سامان ایک دم سے لاوارث ہو گیا۔

تمہارے جانے کے بعد تمہارے ورثا نے اسے لمحوں میں ٹھکانے لگا دیا۔ تمہاری اتنی گراں مایہ متاع حیات کی ایسی بے قدری دیکھ کر میرا دل دکھی ہو گیا۔ ہاں بس ایک اطمینان ضرور ہے..... کہ تم جو اس چھوڑ جانے والے سامان کے لیے اتنی باذوق تھیں، تو یقیناً ساتھ لے جانے والے سامان کے لیے بھی تم نے اتنی ہی فکر کی ہو گی۔ اللہ تمہارے لیے اگلی سب راہیں آسان کرے آمین۔

عورت کی راج دھانی

(عظمیٰ آفرین کراچی)

باورچی خانے کو عورت کی راج دھانی کہا جاتا ہے اور یہ تصور صرف مشرق ہی نہیں بلکہ مغرب میں بھی موجود ہے جہاں عورت گھر کے کچن کی بجائے باہر کی مصروفیت سے زیادہ بندھی ہوئی ہے۔ سو یہ حقیقت ہے کہ عورت اور باورچی خانہ لازم و ملزم ہیں۔ وہ اپنے باورچی خانے میں ایک ملکہ کی طرح ہوتی ہے۔

باورچی خانے کے برتن، کفگیر، پتیلے، چمچ، پلیٹیں، گلاس ہوں یا شیلفس پر بچھی پلاسٹک کی شیٹ سب پر اس کے سلیقے اور سگھڑاپے کے نقش ہوتے ہیں توے پر پھولتی روٹی، گھی میں سنکتا پراٹھا، چولہے پر چڑھی ہانڈی، کیتلی سے اٹھتا دھواں ہر ایک شے میں گھر کی عورت کا عکس نظر آتا ہے کیونکہ کھانے میں لذت، شربت میں مٹھاس، زردے میں شیرینی، کوفتوں میں گھلاوٹ صرف عورت ہی کے دم قدم سے ہے۔ جس کے قدم شب و روز باورچی خانے میں اس لیے گزرتے ہیں کہ وہ اپنے پیارے گھر والوں کو بہترین کھانا کھلا سکے۔ ان کیلئے لذت کام و دہن کا خیال رکھتے ہوئے کبھی کبھی خود اس کے اپنے حصے کی تازگی بھی چولہے کی آگ میں دھواں ہونے لگتی ہے۔

باورچی خانہ عورت کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے کہتے ہیں کسی عورت کے سلیقے کا اندازا لگانا ہو تو اس کے گھر کے باورچی خانے اور غسل خانے کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ پرانے وقتوں میں تو کسی لڑکی کا رشتہ لینے جاتے تھے تو خواتین باورچی خانے کو ایک نظر دیکھنا ضرور پسند کرتی تھیں تا کہ باورچی خانے کے رکھ رکھاؤ سے گھر کی بیٹی کی تربیت اور سلیقے کا اندازہ لگا سکیں۔ جب باورچی خانے کی بات ہو تو ہمیں وہ باورچی خانہ ضرور یاد آتا ہے جو ہماری ماں کے وجود سے مہکتا تھا۔ ماں کے مہربان ہاتھوں سے لذت کھانوں میں گھلتی تھی اور سادہ آلو گوشت، دال، سبزی اور چٹنی میں بھی عام دنیا کا بہترین ذائقہ ملتا تھا۔ ماں کے کچن میں چولہے کی حرارت سے زیادہ ممتا کی حرارت اور حدت ہوتی تھی۔ جن برتنوں کو ماں نے چھوا ہے ان سے اس کی خوشبو آج بھی آتی ہے۔ حسن عباسی کا کیا خوب صورت شعر ہے۔

؎ برتنوں سے ہاتھوں کی خوشبوئیں نہیں جاتیں
خاک اوڑھنے والے رمز یاد آتے ہیں

ایک انگریزی نظم کا ترجمہ کچھ یوں ہے

جب میں باورچی خانے میں کھانا پکاتی ہوں تو صرف کھانا نہیں پکاتی..... بلکہ زندگی گزارنے کے اصول بھی سیکھتی ہوں..... کیک بناتے ہوئے میں تراکیب پڑھتی ہوں غور سے..... کہ کیسے کتنی اور کیا لانی ہے چیز..... کسے کرنا ہے مکس کیسے..... ذرا سی بے احتیاطی کیک کو خراب کر دے گی..... میں سیکھتی ہوں..... زندگی میں ایسی ہی احتیاط ضروری ہے..... جیسی کیک بناتے ہوئے مجھے کرنا پڑتی ہے..... کچن میں کام کرتے ہوئے میں صرف کھانا نہیں پکاتی..... بلکہ زندگی گزارنے کے اصول بھی سیکھتی ہوں۔

☆☆☆

کچن کارنر

ہاٹ اینڈ سار سچوان سوپ

اجزاء: چکن ۱۲۵ گرام ابلا ہوا چھوٹے ٹکڑوں میں، یخنی ۵ کپ، مونگ کے کلے ۱۲۵ گرام، پیاز ا عدد (درمیانے سائز میں کٹی ہوئی) لیموں ا عدد رس نکال لیں، سویا ساس ۲ کھانے کے چمچ، میدہ ۲ کھانے کے چمچ، نمک، کالی مرچ حسب ذائقہ، آئل ۲ کھانے کے چمچ۔

ترکیب: آئل گرم کر کے پیاز فرائی کریں۔ جب پیاز نرم ہو جائے تو یخنی ڈال دیں۔ ساتھ ہی چکن اور مونگ کے کلے بھی شامل کر دیں۔ تھوڑی دیر بعد چولہے سے اتار لیں۔ میدہ پانی میں ملا کر آہستہ آہستہ ڈالیں۔ ساتھ چمچ ہلاتے رہیں تا کہ گٹھلیاں نہ بنیں۔ ساتھ ہی باقی اجزاء بھی ڈال دیں اور دیگچی پھر چولہے پر چڑھا دیں۔ پکنے دیں۔ جب ابال آئے تو چمچ سے ہلاتے رہیں۔ ایک دو ابال کے بعد آنچ دھیمی کر دیں اور ڈھکن سے ڈھانپ کر آدھے گھنٹے کے لیے پکنے دیں پھر اتار کر گرما گرم پیش کریں۔

چکن پکوڑے

اجزاء: پانی ۱۵۰ ملی لیٹر یا ۵ اونس، پیاز ایک درمیانی موٹی کٹی ہوئی، لہسن پیسٹ ایک کھانے کا چمچ، تازہ ہری مرچیں موٹی کٹی ہوئی ا تا ۲ عدد، دھنیا کے پتے کٹے ہوئے ۲ کھانے کے چمچ، بیسن چھنا ہوا ۱۲۵ گرام، دھنیا پسا ہوا ایک چائے کا چمچ، زیرہ پسا ہوا ایک چائے کا چمچ، گرم مصالحہ ۲/۱ چائے کا چمچ، مرچ پسی ہوئی ۲/۱ چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، سوڈا بائی کاربونیٹ ا چٹکی، چکن بریسٹ ۳۲۵ گرام (بغیر ہڈی کے) تیل ڈیپ فرائی کے لیے۔

ترکیب: پانی ۹۰ ملی لیٹر (۳ اونس) لیں۔ اس میں پیاز، لہسن، ہری مرچ اور دھنیا کے پتے ڈالیں۔ انھیں ملائیں یہاں تک کہ وہ یکجان ہو جائیں یا پھر فوڈ پروسیسر میں پانی کے بغیر اجزاء کو مکس کریں۔

بڑے برتن میں بیسن، دھنیا، زیرہ، گرم مصالحہ، پسی ہوئی مرچ، نمک اور سوڈا بائی کاربونیٹ ملائیں، یکجان کیے ہوئے اجزاء ڈالیں اور اچھی طرح ملائیں۔

باقی ماندہ پانی ڈالیں اور اچھی طرح ملائیں تا کہ گاڑھا پیسٹ بن جائے۔ چکن کے ٹکڑے کاٹ لیں اور آہستہ سے پیسٹ میں ملائیں یہاں تک کہ پیسٹ پوری طرح ٹکڑوں پر لگ جائے۔ تیل کو درمیانی آنچ پر گرم کریں جب گرم ہو جائے تو کھانے کے چمچ سے بیسن لگے ہوئے چکن کے ٹکڑے ایک ایک کر کے اس قدر ڈالیں کہ پین میں آسانی سے آ جائیں اور یہ دیکھ لیں کہ ہر ٹکڑے پر پیسٹ اچھی طرح لگا ہو۔ آنچ کم کر کے پکوڑوں کو ۱۰ تا ۱۵ منٹ تک بھونیں۔ درمیان میں انھیں ایک دفعہ پلٹیں۔ پکوڑوں کو سوراخ دار چمچ سے نکالیں اور جاذب پیپر پر خشک ہونے کے لیے رکھ دیں۔

سویٹ نوڈلز

اجزاء: نوڈلز ۲/۱ پیکٹ، چینی حسب ذائقہ، جیلی ا پیکٹ، کیوڑہ چند قطرے، پستہ بادام ۲ کھانے کے چمچ کٹا ہوا، ناریل دو کھانے کے چمچ (پسا ہوا) کشمش ۱۲ عدد، سبز الائچی ۵ عدد، دودھ ا کلو۔

ترکیب: نوڈلز ابال لیں۔ دودھ کو اتنا گرم کریں کہ آدھا کلو رہ جائے۔ اس میں چینی ڈال کر جوش دے لیں اور ساتھ ہی الائچی، کیوڑہ، کشمش اور نوڈلز ڈال دیں۔ مزید تھوڑی دیر پکائیں اور باؤل میں نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔ جیلی تیار کر کے ٹھنڈی کر لیں جیلی کی ڈیزائننگ کر کے سویٹ نوڈلز پر ڈیکوریٹ کر دیں اور ساتھ ہی ناریل، پستہ، بادام بھی چھڑک دیں۔ مزیدار سویٹ نوڈلز تیار ہیں۔ ٹھنڈا کر کے سرو کریں۔☆

محشرِ خیال

ڈاکٹر تزئین زیدی۔کراچی

اپریل کا شمارہ ہر طرح لائق تحسین ہے۔سرورق سے لے کر کوہ نور اشتہارتک دلکش رنگوں سے مزین۔مضامین ''قیامت کی گھڑی'' اور ''منافقت'' ایمان تازہ کر گئے۔آپ کے اداریہ کا جواب نہیں۔ فرزانہ چیمہ کے نانعے گراں ہیں۔صحت یا بیماری پر مضمون بیماروں کیلئے خصوصیت سے طمانیت بخش ہے۔احمد ندیم قاسمی کا افسانہ معاشرے کی منافقانہ روش کا عکاس ہے۔نمایاں خواتین کا تذکرہ جاری رہنا چاہئے۔تبصرہ کتب اس بار تو خاصا تفصیلی رہا۔کتاب ذریعہ انقلاب میں خطبات پر تاثرات بھرپور ہیں۔''ارجمنی'' کا آغاز اچھا ہے اور فی زمانہ یہی ہو بھی رہا ہے۔بتول میگزین کے افسانچے اچھے جا رہے ہیں۔خفتگان خاک کے زیرعنوان ساجدہ ناہید نے اپنے مرحوم دادا جان کی والہانہ دینی وابستگی بڑے خلوص سے تحریر کی ہے اللہ اس عظیم شخص کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔آمین۔

شہد کے بارے میں معلوماتی مضمون خوب رہا۔قانتہ رابعہ اور شگفتہ نقوی کی تحاریر سدا ہی پسند کی جاتی رہیں گی۔ڈاکٹر نزہت اکرام کافی دیر سے بتول کے صفحات پر نظر نہیں آ رہیں ان کا انٹرویو اکثر یاد آتا ہے۔بیٹیوں سے تذکرہ کرتی رہتی ہوں۔ان کے کچھ ناول زیر مطالعہ ہیں۔قسط وار شائع ہوتے تو بتول اور چمک اٹھتا۔چینج آنا چاہئے۔

صائمہ اسماء کا اور کوئی شعری مجموعہ زیر طبع ہے؟اس پر انکا تبصرہ بہت شاندار تھا جو بتول میں شائع ہوا تھا۔

☆جی نہیں!

حافظہ نسیم جہاں۔راولپنڈی

مئی کا بتول میرے سامنے ہے۔

زیب النساء، امید، ام کلثومؓ لازوال تحریریں ہیں۔بتول نے اپنی سابقہ روایات کو بڑے احسن طریقے سے برقرار رکھا ہے۔یہ وہ میگزین ہے جسے ہر باشعور گھرانہ پسند کرتا ہے۔میں نے ایک گاؤں میں بھی بتول کا شمارہ دیکھا جسے باری باری کچھ لڑکیاں پڑھ رہی تھیں۔ مستقبل قریب میں کوئی عالمی سطح پر افسانہ نمبر شائع کریں۔حق اور سچ کا بول بالا ہوتا ہے۔لیکن یہاں سچ بولنا گناہ کبیرہ کہلاتا ہے۔اللہ تعالیٰ ارباب اختیار کو سچ بولنے کی توفیق عطا فرمائے اور پاکستان سدا سلامت رہے۔آمین۔

فارعہ سہیل۔اسلام آباد

مئی کے بتول کا شمارہ مہینے کے شروع میں ہی مل گیا۔خوشی خوشی سب سے پہلے سلسلہ وار کہانی کھولی۔اختتام بہت ہی اچھا لگا۔سب سے اچھی بات یہ تھی کہ پوری کہانی دلچسپ تھی۔اکثر لکھاری اس دلچسپی کو برقرار نہیں رکھ پاتے۔حمیرا خالد کا افسانہ 'اندیشے' آج کل کے پروپیگنڈے ''چھوٹا خاندان زندگی آسان'' کا بڑا اچھا جواب ہے۔نیا سلسلہ ''جواب حاضر ہے'' بہت خوب ہے۔آسیہ راشد بہت ہی اچھے انداز میں حضورؐ کی صاحب زادیوں کا تعارف کرا رہی ہیں۔امینہ بتول نے بھی ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں'' لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ واقعی ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جن میں برائی کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت ہے۔خدا بتول کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔آمین ثم آمین

❁❁❁

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

یادیں

وقت دسترس سے نکلتا جاتا ہے.....صرف اس کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں.....جیسے تتلیوں کے رنگ مٹھی میں!

انسانی یادداشت ایک ایسی سائنس ہے جس کو سمجھنا، سمجھانا مشکل ہے۔ اللہ رب العزت کے عجائبات بے شمار میں سے ایک عجوبہ .....اور پھر یادیں کتنی عجیب شے ہیں۔ یہی اداس کرتی ہیں، خوش کرتی ہیں، شرمندہ کرتی ہیں، فخر وغرور کا احساس دلاتی ہیں۔ شکر کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔ فکر کی جولان گاہ میں لے جاتی ہیں۔ یہی یادیں انسان کو بے کار مضمحل کر دیتی ہیں کبھی عمل پہ ابھارتی ہیں۔ قرب کا باعث بنتی ہیں تو کبھی دوری کا احساس دلاتی ہیں۔ یادیں ظالم بھی ہیں مہربان بھی، کانٹے بھی ہیں پھول بھی۔ تلخ بھی ہیں تو شیریں بھی۔ ایک انسان ہے یادیں لامتناہی، زندگی کا رخ بدلتا جاتا ہے تو یادوں کا پہلو بھی بدلتا جاتا ہے۔ ایک مقام پہ بیٹھا انسان کبھی صحرا میں ہے کبھی نخلستان میں کبھی اندھیرے میں کبھی اُجالے میں۔ یادوں کا سفر ایسا ہے جیسے اونٹوں کی لمبی قطار۔ جن کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔ ایک کے بعد ایک، ہر اونٹ پہ یادوں کا سامان لدا ہے۔ کہیں حسرتوں کے تھیلے لٹک رہے ہیں۔ کہیں خوشیوں کی پوٹلیاں۔ اونٹوں کی پیٹھوں پر کجاوے کا وزن برابر ہے۔ لگتا ہے حسرتوں، پشیمانیوں اور خوشیوں کے تھیلے دونوں طرف توازن سے رکھے گئے ہیں۔ اللہ رب العزت نے انسان کی زندگی کو دکھ اور سکھ کی برابر میزان کے ساتھ زندگی کے کجاوے میں ڈال دیا ہے۔

پھول کے ساتھ کانٹا ہے کہ اس کی حفاظت کرتا رہے۔ سکھ کے ساتھ دکھ ہے کہ سکھ کی پہچان قائم رہے۔ دنیا کے آلام بھی خوشیوں کی دولت کو محفوظ و مامون رکھنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ بھلا رات نہ ہوتی تو دن کا اُجالا کس کو اہم لگتا؟ دن کی مشقت نہ ہوتی تو رات کا سکون کس کو نعمت لگتا؟ زندگی بھی کبھی رات ہے کبھی دن، کبھی دھوپ ہے کبھی چھاؤں.....کبھی صحت ہے کبھی بیماری، بیماری میں صحت کی یادیں ہیں، تو صحت میں بیماری کی یادیں۔ انسان گویا یادوں کے سہارے جیتا ہے، سیکھتا ہے، آگے بڑھتا ہے، اپنی اصلاح کرتا ہے، منصوبہ بندی کرتا ہے۔ ماضی کی یادیں اصلاح کرتی ہیں۔ مستقبل کے خیالات منصوبہ بندی کراتے ہیں۔

گزرے وقت کی یادیں انسان کو خوش کرتی ہیں یا افسردہ۔ کامیابیاں یاد آتی ہیں تو روح خوش ہو جاتی ہے۔ ناکامیاں، کوتاہیاں، غلطیاں اور لاپروائیاں یاد آتی ہیں تو انسان کی روح پژمردگی محسوس کرتی ہے۔ جو وقت گزر گیا وہ اپنے نقوش یادوں کی صورت میں چھوڑ جاتا ہے۔ بس کچھ مادی اشیاء پاس نہیں رہتیں۔ ساری دولت، مکان، آسائشوں کے سامان اپنی دسترس سے نکلے جاتے ہیں۔ ان کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ جیسے تتلیوں کے رنگ مٹھی میں باقی رہ جائیں۔ یہ دنیا اور اس کے سب سروسامان موت سے پہلے ہی ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں۔ جب انسان ایک چارپائی کا مالک رہ جاتا ہے اور ساتھ اس کی یادیں.....وہ بھی اگر یادداشت وفا کرے تو!

قبر وہ مقام ہے جہاں صرف یادیں ہی یادیں ہوں گی۔ قیامت تک اُس کو اپنے اچھے برے اعمال دکھائی دیتے رہیں گے اور وہ ان گزرے لمحوں کی یادوں کی مناسبت سے اپنی روح کو تر و تازہ کرتا رہے گا یا پھر روح کی ناخوشی کا عذاب سہتا رہے گا۔ پھر وہ وقت جب اُسے اپنے ہر عمل کی یاد اپنے خالق کے سامنے سرخرو کر رہی ہو گی یا ندامت سے دنیا واپس جانے کی خواہش مچل رہی ہو گی۔ تاکہ وہ ان بری یادوں کو ختم کر کے کسی اچھی، دل خوش کن، رب کو راضی کرنے والے اعمال کی یادوں کا ذخیرہ لا سکے۔

''پھر یاد کرے گا سب گزرا وقت.....مگر اب یاد کرنے کا کیا فائدہ ہوگا؟!!''

اس حمام میں سب ہی ننگے

تفہیم القرآن (مولانا مودودی) میں حضرت ابوبکر صدیق سے منسوب ہے کہ آپ نے ایک خطبہ میں رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ ''جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ برائی کو دیکھیں اور اس کو بدلنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم تم پر لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو ورنہ اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم میں سے بدترین ہونگے اور وہ تم کو سخت تکلیفیں پہنچائینگے پھر تمہارے نیک لوگ خدا سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہونگی۔''

اس کے علاوہ علامہ ابن قیم سے منسوب ہے کہ ایک شخص ایک دوسرے شخص کو قتل کرنے کی نیت سے اس کا پیچھا کر رہا تھا جان بچانے والے بھاگتے ہوئے شخص کو ایک تیسرے آدمی نے پکڑ لیا اور پہلے آدمی نے اس آدمی کو قتل کر دیا۔ وہاں ایک شخص کھڑا یہ واقعہ دیکھ رہا تھا اس نے اس میں دخل اندازی نہیں کی۔ اور قاتل کو اس گناہ، جرم کرنے سے نہیں روکا۔ جب یہ مقدمہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے قاتل کو دوسرے مقتول کو پکڑنے والے شخص کو اور تیسرے تماشہ بین کو شخص کو سخت سزا کا مستحق قرار دیا۔ گویا اس شخص کو بھی مجرم قرار دیا جو کھڑا تماشہ دیکھتا رہا اور اس برے کام (قتل) کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔

ان آیات اور احادیث اور ابن قیم کی روایت کی روشنی میں اب میں حکمرانوں سے مخاطب نہیں بلکہ عوام سے مخاطب ہوں اور ان کی توجہ اس اہم بات و فرض کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ موجودہ حکمرانوں کی نااہلی اقربا پروری اور رشوت ستانی میں ان کی اعانت یا خاموشی ان کا مجرموں اور ظالموں کے زمرے میں شامل کرتی ہے ان کی خاموشی اور اعانت ان کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں گناہ گار اور مجرم بنا رہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے کردار کیلئے نہایت ہی شدید اور تکلیف دہ عتاب سے خبردار کیا ہے۔

آیئے اب ان حکمرانوں کے مصدقہ صورت کا تذکرہ کرتا ہوں۔ موجودہ حکمرانوں اور پچھلے حکمرانوں کو شاید یہ پسند نہ آئے گا مگر خاموش تماشائی بن کر گناہ گار نہیں بن سکتا۔

میں آپ کی توجہ ایک کتاب Capitalism's Achilles Heel کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ اس کے مصنف Raymond W baker ہیں یہ انٹرنیٹ پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کتاب میں بینظیر بھٹو، آصف زرداری اور نواز شریف کی رشوت لینے کی داستانیں ہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ ضیاء الحق کی حادثہ میں ہلاکت کے بعد جب بینظیر وزیراعظم بن گئیں تو تقریباً 26000 جیالوں کو سرکاری اداروں میں ملازمتیں دیدیں اور اس میں قومیائے ہوئے سرکاری بینک بھی شامل تھے۔ یہی نہیں بلکہ بینظیر اور زرداری نے اربوں روپیہ کے قرضے ان بینکوں سے اپنے دوستوں اور یاروں کو دلوائے جن کیلئے کوئی مناسب ضمانت نہیں تھی۔ کہا گیا ہے ان دونوں نے یہ قرضے اپنے نمائندوں کے نام سے لیے اور اس میں سے 41 کروڑ روپوں سے تین شوگر ملوں میں اکثریتی حصے خرید لیے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زرداری نے پاکستان سٹیل ملز کیلئے سامان کی خریداری میں اپنے نمائندے (عثمان فاروقی) کی معروفت چار کروڑ روپے لے لیے۔ مصنف نے یہ بھی بتایا (جو کہ

پوری قوم کو پتا ہے) کہ سوئٹزرلینڈ کمپنی ایس جی ایس سے پاکستان میں آنے والی اشیاء کی پیشگی جانچ پڑتال کے ٹھیکے دینے کے بدلہ میں زرداری اور بینظیر کو 12 ملین ڈالر دیئے گئے جو کہ برٹش آئیر لینڈ میں دو کمپنیوں کے اکاؤنٹ میں جمع کیے گئے اس کے بعد پولینڈ سے 83 ملین ڈالر کے ٹریکٹر خریدے گئے اور اس پر کمپنی کے ریکارڈ کے مطابق تقریباً 5.8 ملین ڈالر رشوت لی گئی اور ٹریکٹروں پر سے درآمدی ڈیوٹی معاف کردی جس سے ملک کو ایک ارب ستر کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ اس کے بعد فرانس سے میراج جہازوں کی 4 ارب ڈالر کی خریداری پر تقریباً دوسو ملین ڈالر رشوت لی گئی۔ اور کچھ ہی عرصہ میں یہ رقم 40 ملین ڈالر تک پہنچ گئی۔ کتاب میں مزید انکشاف کیا ہے کہ نواز شریف کے اہلکاروں نے غیر سرکاری سراغ رسانوں سے یہ تمام معلومات ایک ملین ڈالر میں خرید لیں۔ غالباً یہ سیف الرحمٰن کا کام ہوگا جس کو ایک سابق وزیر قانون خالد انور نے ایک پریس کانفرنس میں شرلک ہومز بنا کر پیش کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کاغذات جینوا میں زرداری کے فرنٹ مین جینس شلیگیل ملش کے دفتر سے حاصل کیے گئے تھے۔ کتاب میں ان تمام جائیدادوں، فرنٹ کمپنیوں اور لاتعداد غیر ملکی اکاؤنٹ نمبروں کی تفصیلات درج ہیں۔ بعد میں نیویارک ٹائمز نے اس پر تبصرہ کر کے بینظیر اور زرداری کی رشوت ستانی کا ذمہ دار مغربی پراپرٹی ڈیلرز وکلاء، بینکس اور مغربی دوستوں کو ٹھہرایا ہے۔ بعد میں سوئٹزرلینڈ نے ان دونوں کے 17 بینک اکاؤنٹ منجمد کر دیئے۔ دونوں پر منی لانڈرنگ اور ایس جی ایس سے رشوت وصول کرنے کے الزام میں 2003ء میں جرمانہ اور سزائے معطل دیدی گئی۔ ان کی اپیل پر یہ مقدمہ دوبارہ سنوائی کیلئے متعلقہ پراز یکیوٹرز کو بھیج دیا۔ بینظیر کے اس بیان پر کہ ہم عوام کو محبت وخلوص دیتے ہیں اور ہمیں محبت اور خلوص ملتا ہے۔ مصنف نے لکھا کہ اپنے آنسو محفوظ رکھو۔ دنیا کے ملک بدر حکمرانوں میں بینظیر بھٹو یقیناً سب سے کم ہمدردی کی مستحق لیڈر ہے۔

جہاں تک سوئس کیسز کا تعلق ہے کہ 29 اکتوبر 2007 کو تحقیقاتی مجسٹریٹ نے زرداری اور بینظیر کو سزا سنائی تھی اور اس کے خلاف ان دونوں کی اپیل بھی کورٹ آف اپیل نے 19 مارچ 2008 کو مسترد کردی تھی اور اب صرف کورٹ نے ان مجرموں کو سزا سنا کر جیل بھیجنا تھا۔ یہاں این آر او کام آیا اور زرداری اور گیلانی نے فوراً بے ضمیر اٹارنی جنرل ملک عبدالقیوم کو خط لے کر بذات خود سوئٹزرلینڈ بھیج دیا کہ اب یہ مقدمہ ختم ہوگیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد سرے پیلس کیس میں ملوث لندن میں پاکستان ہائی کمشنر واجد شمس الحسن نے خود جینوا جا کر وین بھر کر تمام کاغذات اٹھا لیے۔ سرے پیلس کے بارے میں زرداری اور بینظیر نے مسلسل کہا کہ ان کا نہیں ہے مگر جب اس کا نیلام ہوگیا تو زرداری نے فوراً دعویٰ کر کے تقریباً 4 یا 5 ملین پونڈ حاصل کر لیے۔

اگر وہ خط نہ بھیجا جاتا تو دونوں کی سزا ہو جاتی اور پاکستانی سیاست اس لعنت سے محفوظ رہتی۔ گیلانی اور ان کے خاندان کے رشوت ستانی کے قصے نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ پی پی پی کے وزراء کی رشوت ستانی بھی ہر شخص کو معلوم ہے۔

جہاں تک نواز شریف اور ان کے پیاروں کا تعلق ہے کتاب میں ان کی رشوت ستانی اور غلط کاموں کی تفصیل ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ نواز شریف کے پنجاب کے وزیر خزانہ اور پھر وزیر اعلیٰ بننے کے کچھ ہی عرصہ میں ایک تنہا اتفاق فونڈری 30 بڑے صنعتی اداروں میں تبدیل ہوگئی۔ جو سٹیل، شوگر، کاغذ، ٹیکسٹائل، وغیرہ میں سرگرم ہو گئے اور ان کی سالانہ آمدنی تقریباً 400 ملین ڈالر ہوگئی۔ پھر لاہور سے اسلام آباد ہائی وے جنوبی کوریا کی کمپنی کو 20 ارب روپے سے زیادہ رقم دے کر تیار ہوا۔ پھر تقریباً 700 ملین ڈالر کی 50000 کاریں بطور پیلی ٹیکسیاں خریدی گئیں۔ ایک بینک سے قرض لیا گیا اور ایک کمرشل بینک سے آرڈر دیئے گئے۔ متوالوں نے گاڑیاں اٹھالیں۔ جن میں احمقانہ طور پر نواز شریف نے مہنگی کاریں بھی شامل کر دی تھیں جو چند ماہ بعد کالا رنگ کرا کر پرائیویٹ طور پر استعمال ہوئیں۔ قرض واپس نہیں کیے گئے اور بینکوں کے 500 ملین ڈالر کا نقصان ہوا۔ بعد میں بینظیر کی حکومت نے اس بارے میں تفصیلات شائع کر دیں تو علم ہوا

کہ شریف خاندان نے 60 ملین ڈالر ہڑپ کر لیے تھے۔ 1993 میں نواز کی حکومت کے خاتمے کے بعد 30 میں سے صرف 3 صنعتی ادارے کام کررہے تھے۔ زرداری اور بینظیر کی معلومات کی طرح کتاب میں نواز شریف کی غیر ملکی کمپنیوں، اکاؤنٹس اور جائیدادوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان میں خاص حقائق یہ ہیں کہ

لاہور، اسلام آباد ہائی وے کے کنٹریکٹ میں 160 ملین ڈالر لیے۔

تقریباً 140 ملین ڈالر بینکوں سے بغیر ضمانت قرض لیے۔

حکومت سے تقریباً 60 ملین ڈالر شوگر کی برآمدگی میں وصول کر لیے۔

تقریباً 58 ملین ڈالر امریکہ اور کینڈا سے گندم خریدنے میں رشوت وصول کی۔

جہاں تک ایم کیو ایم اور اے این پی اور جے یو آئی ف وغیرہ کا تعلق ہے یہ بھی فرشتے نہیں اور عوام کے سامنے ذرائع ابلاغ نے بار بار نشاندہی کی ہے۔ گویا اس حمام (پاکستان) میں سب ہی ننگے ہیں۔ میں آپ سب کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ ان گناہگاروں اور راشیوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مدد کرتے رہے اور ان کے ساتھی اور ہمدرد بنے رہے تو یاد رکھیے آپ کا حشر موجودہ حالات سے بدتر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا عتاب اور غضب ملے گا اور اس وقت آپ کا رونا دھونا کچھ کام نہ آئے گا اور پھر کوئی آپ کی مدد نہیں کرے گا اور جہنم آپ کا مہمان خانہ ہوگا۔ (روزنامہ جنگ)

☆☆☆